Regd. No. 7243

Phone 880800

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

اگست 1985

اس پرچہ میں

1۔ یوم ازادی

2۔ علامہ اقبال اور زمینداری نظام

شائع کردہ ادارۂ طلوعِ اسلام - ۲۵ بی - گلبرگ - لاہور

قیمت فی پرچہ 4 روپے

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

ماہنامہ ——— لاہور

بدل اشتراک سالانہ پاکستان/۴۸ روپے غیر ممالک/۹۸ روپے	ٹیلیفون: ۸۸۰۸۰۰ خط و کتابت ناظم ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵-بی گلبرگ ۲ لاہور	قیمت فی پرچہ ۴ چار روپے
جلد ۳۸	اگست ۱۹۸۵ء	شمارہ-۸

فہرست

۱۔ لمعات ——— یوم آزادی ——— ۲

۲۔ شریعت اسلامی اور سونے کے زیورات۔ (شاہد عادل) ——— ۱۲

۳۔ داغوں کی بہار۔ (مسلسل) ——— ۱۷

۴۔ حقائق و عبر (۱) قرآن اور شیعہ مذہب (۲) غیر سودی معیشت ——— ۲۱
(۳) علامہ اقبالؒ اور زمینداری نظام

۵۔ قرآن مجید کے ایک نئے اردو ترجمے کی ضرورت۔ (مولوی محمد صاحب) ——— ۲۵

۶۔ ہم پیدائشی مسلمان۔ (راقمہ ثریا عندلیب) ——— ۳۱

۷۔ محرم کے بغیر عورت کا سفر کرنا (محمد ارمغان ثاقب) ——— ۳۶

۸۔ علامہ پرویزؒ صاحب داغِ مفارقت دے گئے۔ (عطاء اللہ جمل صاحب ——— ۴۰
(ایڈیٹر اخبار البلاغ جنوبی افریقہ)

۹۔ افکار پرویزؒ کی صدی (محمد اسلام صاحب) ——— ۴۱

ایڈیٹر۔ محمد خلیل۔ ناشر شیخ عبدالحمید۔ مقام اشاعت ۲۵/بی گلبرگ ۲ لاہور۔ مطبوعہ۔ اشرف پرنٹنگ پریس ۹۔ ایبک روڈ لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

حضور نبی اکرمؐ جب ہجرت کے بعد مدینہ تشریف لائے، تو آپ نے دیکھا کہ یہودی عاشورہ کے دن کا روزہ رکھتے ہیں۔ دریافت کرنے پر انہوں نے کہا کہ اس دن ہمیں فرعون کی غلامی سے نجات ملی تھی۔ ہم اس یوم آزادی کی یاد میں یہ تقریب مناتے ہیں اور روزہ رکھتے ہیں۔ آپؐ نے صحابہؓ سے فرمایا کہ تم بھی ان کے ساتھ اس دن کا روزہ رکھو کیونکہ کسی قوم کی غلامی سے رستگاری اسی قوم کے لئے باعثِ مسرت نہیں ہوتی۔ وہ ساری انسانیت کے لئے وجہ شادمانی ہوتی ہے۔ اس لئے ایسی تقاریب کو عالمگیر حیثیت سے منانا چاہیئے۔

اس میں شبہ نہیں کہ قوموں کی زندگی میں بعض واقعات ایسے آتے ہیں جن کی یاد قائم رکھنا ضروری ہوتا ہے، لیکن یاد کوئی "بت" نہیں ہوتی کہ اس کی پرستش کی جائے۔ یہ ذریعہ ہوتی ہے شعورِ ملّی میں اس انقلاب کو تازہ رکھنے اور آگے بڑھانے کا جس کی یاد میں وہ تقریب منائی جاتی ہے۔ مسلمانانِ ہند کی ملّی زندگی میں اسی قسم کا ایک انقلاب آفریں دن آیا جسے ہم یوم آزادی کہہ کر پکارتے ہیں۔ یہ دن، درحقیقت حدِ فاصل تھا ہماری گذشتہ اور آئندہ زندگی میں۔ یہ دن تھا اس عہد کا کہ ہماری آنے والی زندگی گذشتہ زندگی سے یکسر مختلف ہو گی۔ ہماری گذشتہ زندگی تھی انسانوں کے وضع کردہ نظام کے تابع چلنے کی۔ وہ نظام جو موجب تھا ہمارے اخلاقی تسفّل اور ملّی تنزل کا، جس نے ہمیں شرفِ انسانیت سے یکسر محروم کر رکھا تھا۔ جس میں سرمایہ دار غریبوں کی محنت کے ماحصل کو لوٹ کھسوٹ کر لے جاتا تھا۔ جس میں مزدوروں کے خون کی سرخی، اربابِ ثروت کے عشرت کدوں کی رنگینی کا سامان فراہم کرتی تھی۔ جس میں غریبوں کی ہڈیاں اُمراء کے قصرِ تعیش کے لئے چونا بنتی تھیں۔ دو لفظوں میں یوں کہئے کہ یہ وہ نظام تھا جس نے ہمیں خیر و برکت کے ہر چشمہ سے دور پھینک رکھا تھا۔ ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کا دن اس اعلان کا دن تھا کہ: جَاءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ۔ وہ انسانیت سوز نظام ختم ہوا اور ہم نے ایک ایسا خطۂ زمین حاصل کر لیا جس میں اس نظام کا آغاز کیا جائے گا۔ جس کا سرنامہ "احترامِ آدمیت" ہے۔ جو انسانوں کا وضع کردہ نہیں بلکہ اقدارِ خداوندی کا مظہر ہے۔ یہ ہے وہ دن جسے یوم آزادی سے تعبیر کیا جاتا ہے اور جس کی رسمی اور بے روح تقریب ہر سال منائی جاتی ہے۔ اس آزادی کے اڑتیس سال کے عرصے میں ہم کہاں پہنچ گئے ہیں، اُسے زبانِ قلم تک لانے کی ہم تاب نہیں لا سکتے۔ یہ سینوں میں دبی ہوئی وہ آگ ہے جس کے متعلق کہا گیا ہے ——— اگر گویم زباں سوزد ———
وگر دم در کشم ترسم کہ مغزِ استخواں سوزد۔

قرآنِ کریم میں یوں، تو مختلف اقوامِ سابقہ کے عروج و زوال کی داستانیں بیان کی گئی ہیں، لیکن انہیں داستانِ بنی اسرائیل کو بڑے اصرار اور تکرار سے دہرایا گیا ہے۔ ہماری بصیرت کے مطابق، یہ اس لئے کہ خدائے علیم و خبیر کو معلوم تھا کہ صدرِ اوّل کے بعد امتِ مسلمہ قوم بنی اسرائیل کے قدم بقدم چلے گی اور جو کچھ اس قوم کے ساتھ بیتی وہی اس اُمت پر بھی گزرے گی۔ ذرا غور کیجئے کہ ملّتِ پاکستانیہ اور قومِ بنی اسرائیل میں کس قدر مماثلت ہے۔ جس طرح ہم ہندوستان میں ہندو اور انگریز کی غلامی کے شکنجے میں جکڑے ہوئے تھے اسی طرح بنی اسرائیل فرعون کی محکومیت کی زنجیروں میں مقید تھے۔ ان حالات میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ وَنُرِيدُ أَنْ نَمُنَّ عَلَى الَّذِينَ اسْتُضْعِفُوا فِي الْأَرْضِ وَنَجْعَلَهُمْ أَئِمَّةً وَنَجْعَلَهُمُ الْوَارِثِينَ ۝ وَنُمَكِّنَ لَهُمْ فِي الْأَرْضِ۔ (28/5) "ہم نے ارادہ کیا کہ جس قوم کو اس قدر کچلا جا رہا تھا۔ اسے ہم سرفرازیاں عطا کر دیں اور اسے ایک ایسے خطۂ زمین کا مالک بنا دیا جائے جہاں ان کی اپنی حکومت ہو"۔ یہ خدا کا ایسا انعام تھا جس کی انہیں یہ کہہ کر بار بار یاد دہانی کرائی جاتی تھی کہ: يَا بَنِي إِسْرَائِيلَ اذْكُرُوا نِعْمَتِيَ الَّتِي أَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَأَنِّي فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعَالَمِينَ۔ (2/47) "اے بنی اسرائیل تم ہماری اس نعمت کو یاد کرو جس سے ہم نے تمہیں نوازا تھا اور تمہیں تمہاری ہمعصر اقوام میں بلند مقام عطا کر دیا تھا"۔ آپ نے غور کیا! کہ داستانِ بنی اسرائیل کے اس واقعہ اور حصولِ پاکستان میں کس قدر مماثلت ہے۔

لیکن اس کے بعد بنی اسرائیل نے کس طرح کفرانِ نعمت کیا اس کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں۔ قرآن کریم کے صفحات اس سے بھرے پڑے ہیں۔ اس کا نتیجہ کیا ہوا، اسے ان عبرت آموز الفاظ میں دہرایا گیا کہ: وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ وَبَاءُوا بِغَضَبٍ مِنَ اللَّهِ (2/61) "ان پر خدا کا غضب طاری ہوا جس کا نتیجہ یہ تھا ان پر ذلّت اور مسکنت کی مار ماری گئی۔ وہ غیروں کی نگاہوں میں ہی نہیں خود اپنی نظروں میں بھی ذلیل و خوار ہو گئے۔ حتیٰ کہ نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ: ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ أَيْنَ مَا ثُقِفُوا۔ (3/112) وہ جہاں بھی گئے ذلّتیں اور رسوائیاں سائے کی طرح ان کے پیچھے لگی رہیں، اور کوئی گوشہ ایسا نہ رہا جہاں انہیں حقارت کی نظروں سے نہ دیکھا گیا ہو۔

نگاہِ عبرت سے دیکھئے کہ کیا بنی اسرائیل کی اس کیفیت اور ہماری موجودہ حالت میں کچھ بھی فرق ہے؟ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ہماری حالت ان سے بھی بدتر ہو چکی ہے۔ وہ "دیوارِ گریہ" کے سامنے کھڑے ہو کر روتے تھے تو اپنے مستقبل کی طرف سے مایوس نہیں تھے۔ ان کے برعکس ہماری حالت یہ ہو چکی ہے کہ جب بھی دو پاکستانی آپس میں ملتے ہیں تو غیر شعوری طور پر ان کے لب پر یہ الفاظ آ جاتے ہیں کہ اب کیا ہو گا؟ کیا پاکستان باقی رہے گا؟ ہم سمجھتے ہیں کہ قوموں کی زندگی میں اس انداز کا یاس اور نا امیدی کا احساس سکراتِ موت کی ہچکیاں ہوتی ہیں۔ ہم اس یاس انگیز تأثر کو زیادہ طول نہیں دینا چاہتے اور نگاہ کا رُخ اس طرف پھیرتے ہیں کہ ایسا کیوں ہوا؟ اس اہم ترین سوال کا جواب تلاش کرنے کے لئے ۳۸ سال کمیشن پر کمیشن بٹھائے گئے، کمیٹیوں پر کمیٹیاں متعین کی گئیں، رپورٹوں پر رپورٹیں لکھی گئیں، لیکن اس کے سوا کچھ نہ ہوا جو غالبؔ نے کہا تھا کہ:۔

تھک تھک کے ہر مقام پہ دو چار رہ گئے   تیرا پتہ نہ پائیں تو ناچار کیا کریں؟

مرض بڑھتا گیا اور اس کا علاج تو ایک طرف، تشخیص تک بھی کسی سے نہ ہوسکی۔ لیکن ہم نے جب قرآنِ کریم کے بابِ عالی پر دستک دی تو اس نے یہ کہہ کر بصد تبسم دروازہ کھول دیا کہ: أُجِيبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ إِذَا دَعَانِ۔ "ہم ہر پکارنے والے کی پکار کا جواب دیتے ہیں۔ اور اس کی ہر مشکل کا حل بتاتے ہیں۔ تمہاری اس مشکل کا حل تو ہم چودہ سو سال پہلے بتا چکے ہیں اور وہ یہ ہے:۔

إِنَّ اللَّهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتَّىٰ يُغَيِّرُوا مَا بِأَنفُسِهِمْ۔ (۱۳/۱۱)

"تم تو ایک طرف، خدا بھی اس قوم کی خارجی دنیا میں کوئی تبدیلی نہیں کرتا جب تک وہ قوم اپنی داخلی دنیا میں تبدیلی پیدا نہ کرلے۔"

غور فرمائیے کہ کس حتم و یقین و تحدّی سے کہا گیا ہے کہ جو جی میں آئے کر کے دیکھ لو۔ جب تک تم اپنے اندر نفسیاتی تبدیلی پیدا نہیں کرو گے۔ جب تک تم اپنے قلب و دماغ کو نہ بدلو گے۔ جب تک تم اپنی ذہنیت میں تبدیلی پیدا نہ کرو گے۔ جب تک تمہاری اقدارِ حیات نہ بدلیں گی، اس وقت تک تمہارے احوال و ظروف میں کوئی تبدیلی نہیں آسکتی۔ یہ اس خدا کا فیصلہ ہے جس کے فیصلے دنیا کی کوئی طاقت نہیں بدل سکتی، سارے انسان مل کر بھی نہیں بدل سکتے۔

اور ہم ہیں کہ ہم نے اڑتیس (۳۸) برس سے خدا کو چیلنج دے رکھا ہے کہ ہم اپنی داخلی دنیا میں تبدیلی کئے بغیر اپنی خارجی حالت میں تبدیلی کر کے دکھائیں گے۔ آپ کے فیصلے کے علی الرغم ایسا کریں گے اور (معاذ اللہ) آپ کے اس دعوے کو جھوٹا ثابت کر دیں گے۔ ہم تیس (۳۰) برس سے خدا کے خلاف یہ جنگ لڑ رہے ہیں۔ ایسا نہ بر بنائے جہالت ہو رہا ہے اور نہ ہی محض اتفاقی طور پر یہ سب کچھ جانتے بوجھتے ایک سوچی سمجھی سکیم کے تحت کیا جا رہا ہے۔ اس اسکیم کی حقیقت بڑے گہرے غور و فکر سے سمجھے جانے کی محتاج ہے۔

تحریکِ پاکستان کی سب سے شدید مخالفت مذہبی پیشوائیت (نیشنلسٹ علماء) کی طرف سے ہوئی تھی۔ ان میں جماعتِ اسلامی پیش پیش تھی۔ ان کا مؤقف اور اعتراض یہ تھا کہ مسلمانوں میں اس قدر اخلاقی عیوب پائے جاتے ہیں۔ ان کے ہاتھوں کوئی اسلامی مملکت قائم نہیں ہو سکتی۔ اسلامی مملکت کا مطالبہ کرنے کی بجائے، اس قوم کے قلب و دماغ کی تطہیر مقدم ہے۔ جب تک ایسا نہیں ہوگا انکی حالت میں تبدیلی پیدا نہیں ہوگی۔ اس کے جواب میں ان سے کہا جاتا کہ یہ جنگ ایک خطۂ زمین حاصل کرنے کی ہے تاکہ اس میں اسلامی مملکت قائم کی جاسکے۔ یہ خطۂ زمین حاصل ہو جائے تو پھر آپ تطہیرِ قلب و نگاہ کے لئے کوشش کیجئے گا۔ اس کے جواب میں وہ پھر یہی کہتے کہ نہیں! تطہیرِ نفس قدم اوّل ہے۔ اس کے بغیر خطۂ زمین کا حاصل کرنا بھی لاحاصل ہے۔ انہوں نے اس وعظ و نصیحت پر ہی اکتفا نہ کیا، اس تحریک کی بھرپور مخالفت کی۔ لیکن ان کی مخالفت کے علی الرغم یہ خطۂ زمین حاصل ہو گیا۔ اور دیکھنے والے کیا دیکھتے ہیں کہ یہ تمام حضرات یہاں جمع ہو گئے۔ اگر انہیں اسلامی مملکت کے قیام کے مسئلہ سے ذرا بھی دلچسپی ہوتی تو ان کے کرنے کا کام یہ تھا کہ قوم میں تطہیرِ فکر و نظر کے لئے تدبیریں سوچتے، اور کوششیں کرتے۔ لیکن یہاں انہوں نے ایک ایسی روش اختیار کی جس سے، اس قسم کی تطہیر کے لئے کچھ کرنا تو

درکنار، کسی کا اس طرف دھیان تک نہ جائے۔ اس کے لئے انہوں نے دہریوں اور ملحدوں کا سا طریق اختیار نہیں کیا۔ جس طرح انہوں نے تحریکِ پاکستان کی مخالفت، مذہب کے نقاب میں کی تھی، اسی طرح یہاں اپنی اس سکیم کو بھی خالص اسلامی پردوں میں آگے بڑھایا۔ انہوں نے یہاں آتے ہی یہ کہا کہ چونکہ اس مملکت کو اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا ہے اس لئے یہاں کرنے کا کام یہ ہے کہ اسلامی قوانین نافذ کئے جائیں۔ آپ سوچئے کہ کسی کا خیال تک تو کجا، تصوّر تک بھی اس طرف جا سکتا تھا کہ یہ مطالبہ مملکتِ پاکستان کی بنیادوں تک کو متزلزل، اور اسلام کو ایک چلا ہوا کارتوس ثابت کر دے گا۔ کوئی شخص ایسا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ اور اگر کوئی سوچ بھی سکتا تو انہوں نے اپنے پروپیگنڈے کا اس قدر شور برپا کیا کہ ہر سوچ اس شور میں ڈوب کر رہ گئی۔ آپ قرآنِ کریم میں شروع سے آخر تک دیکھئے اس نے اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کے بعد عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ کہا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ایمان کے بغیر عملوا الصلحت کا امکان ہی نہیں۔ ایمان کے معنی ہیں تغیرِ نفس۔ اور عملوا الصلحٰت کے معنی ہیں اسلامی قوانین کے مطابق زندگی بسر کرنا۔ یہ وجہ ہے جو اللہ تعالٰے نے کہا کہ جب تک تم میں تغیرِ نفس نہیں ہوگا تمہارے اعمال کوئی نتیجہ پیدا نہیں کر سکیں گے۔ ان حضرات نے تغیرِ نفس کا نام تک نہیں لیا اور اسلامی قوانین کا شور مچاتے چلے گئے۔ یہ ہے وہ جنگ جو انہوں نے یہاں "خدا کے خلاف" برپا کر رکھی ہے اور ایسے نگاہ فریب انداز سے کہ کوئی شخص خیال تک نہیں کر سکتا کہ یہ خدا کے خلاف جنگ اور پاکستان کی مخالفت ہے۔ اس کے برعکس ہر شخص یہ سمجھتا ہے کہ یہ بہت بڑا جہاد ہے جس میں یہ حضرات اس طرح مصروف ہیں۔

"تغیرِ نفس" کے بغیر قوانین کی پابندی کس طرح نتیجہ خیز نہیں ہوتی، اسے ایک مثال سے سمجھئے۔ یہ مثال بھی ہم فوجی زاویۂ نگاہ سے پیش کرتے ہیں۔

۱۹۶۵ء کی جنگ میں ہم نے دیکھا کہ جب دشمن کی یلغار باٹاپور کی نہر تک آ پہنچی تو یہاں کے اچھے اچھے لوگوں نے بھاگنا شروع کر دیا تاکہ وہ اپنی جانیں بچا سکیں۔ جان کا بچانا خود زندگی کا بنیادی تقاضا ہے۔ اور وہ اسی تقاضے کے ماتحت ایسا کر رہے تھے۔ لیکن دوسری طرف ہم نے دیکھا کہ وہ سپاہی جو بیرکوں میں امن و اطمینان سے بیٹھے تھے اور جہاں ان کی جانیں بالکل محفوظ تھیں، وہ نہ چپکے سے وہیں بیٹھے رہے، اور نہ ہی راوی کے پل کی طرف بھاگے، بلکہ اپنے اپنے محفوظ مقامات سے نکل کر انہوں نے میدانِ جہاد کی طرف رخ کر لیا جہاں دشمن کی ہر آہٹ موت کا پیغام دیتی تھی۔ جانیں بچا کر راوی کی طرف بھاگنے والے بھی انسان تھے، اور یہ موت کی طرف لپک کر جانے والے بھی انسان۔ ان دونوں میں فرق کیا تھا؟ صرف "تغیرِ نفس" کا فرق۔ ان سپاہیوں کے اندر یہ نفسیاتی تبدیلی آ چکی تھی کہ جان کی حفاظت بے شک نہایت ضروری ہے لیکن جب کبھی ایسا وقت آ جائے کہ جان اور کسی ایسی "قدر" میں جو جان سے زیادہ عزیز ہو (ع ۳/۲) پڑ جائے تو اس "قدر" کی حفاظت کے لئے جان دے دینا ہی تقاضۂ حیات ہے۔ اس "تغیرِ نفس" کو ایمان کہا جاتا ہے۔ اور اس ایمان کے بعد انسان کی ہر نقل و حرکت عملِ صالح بنتی ہے۔

فوج ایک بہت بڑی تنظیم کا نام ہے۔ اس کی بنیاد نظم و ضبط پر ہے۔ اس میں سپاہیوں کو وقت پر اٹھنا، وقت پر چلنا، اور وہ بھی ایک خاص انداز سے چلنا، ہر صبح پی۔ ٹی کرنا۔ وقتاً فوقتاً فوجی مشقوں کی صعوبات

برداشت کرنا۔ نشانہ بازی کی مشقیں کرنا پڑتا ہے۔ ان تمام امور کیلئے ان کے ہاں قوانین و ضوابط موجود ہوتے ہیں جن کی پابندی ان سپاہیوں پر لازمی ہوتی ہے۔ جس سے اس پابندی کی ذرا سی بھی خلاف ورزی ہوتی ہے اُسے اس کی سزا ملتی ہے۔ اب آپ سوچیئے کہ اگر کسی فوج میں یہ تمام نظم و نسق مکمل شکل میں موجود ہو۔ سپاہی ان کی پابندی بھی حزم و احتیاط سے کرتے ہوں۔ وہ چاق و چوبند بھی ہوں۔ ان کے پاس اعلیٰ درجے کا اسلحہ بھی موجود ہو لیکن خطرہ کا بگل بجنے پر وہ میدانِ جنگ کی طرف رُخ کرنے کی بجائے اپنی جان بچانے کے لئے راہ فرار کی طرف بھاگ نکلیں۔ تو کیا ایسی فوج وہ مقصد حاصل کر سکے گی جس کے لئے اس قدر اہتمام کیا گیا تھا؟ ان سپاہیوں میں کس چیز کی کمی تھی؟ اسی "تغیرِ نفس" کی جس کی بناء پر سپاہی موت کو دلہن کی طرح گلے لگاتے ہیں۔ ان میں ایمان کا فقدان تھا جس کی وجہ سے فوجی نظم و نسق اور قوانین و ضوابط اور ان کی پابندی نہ صرف یہ کہ کوئی مثبت نتیجہ پیدا نہ کر سکی بلکہ ملک کے لئے تباہی کا موجب بن گئی۔ ہمارے یہ مدعیانِ نظامِ اسلامی ایک ایسی فوج پیدا کرنا چاہتے ہیں جو قوانین کی پابندی تو بڑی شدت سے کرے لیکن جس میں "تغیرِ نفس" پیدا نہ ہوا ہو۔ اس مثال سے آپ نے سمجھ لیا ہو گا کہ ان حضرات کی یہ ساری کوششیں جنہیں پاکستان اور اسلام پر احسانِ عظیم کے رنگ میں پیش کیا جاتا ہے کس طرح اسلام اور پاکستان دونوں کے خلاف محاذ آرائی ہے۔

"تغیرِ نفس" عقیدہ یا ایمان۔ خارجی قانون کے بغیر بھی کس طرح مثبت نتائج پیدا کر دیتے ہیں اسے بھی ایک مثال کی رو سے سمجھیئے۔ اس وقت دنیا میں فحاشی عام ہو رہی ہے۔ اور خود ہمارے ملک میں بھی یہ وبا کی طرح پھیل رہی ہے۔ اس کے خلاف ہر طرف سے آوازیں اُٹھ رہی ہیں۔ حکومت کی طرف سے بلند آہنگ تدابیر اختیار کی جاتی ہیں، سخت قوانین بنائے جاتے ہیں۔ لرزہ انگیز سزائیں دی جاتی ہیں۔ لیکن ان سب کے باوجود یہ سیلاب ہے کہ اور تیزی سے بڑھتا چلا آ رہا ہے۔ اسی فضا میں ایک نوجوان لڑکا ہے۔ نہایت بدنام، بدمعاش، عیاش، جنسیات میں ڈوبا ہوا تھا۔ معاشرہ کی کوئی لڑکی اس کے ہاتھوں اپنی عصمت محفوظ نہیں سمجھتی۔ اس لڑکے کی ایک ہمشیرہ ہے۔ نوجوان، خوبصورت، ناکتخدا۔ وہ دونوں ایک کمرے میں رہتے ہیں اور وہیں راتوں کو تنہا سوتے ہیں، عورت ہونے کی جہت سے اس لڑکی اور ان لڑکیوں میں کوئی فرق نہیں جن کے پیچھے یہ مارا مارا پھرتا ہے۔ لیکن راتوں کی تنہائیوں اور تاریکیوں میں بھی وہ اس لڑکی طرف جو اس کی بہن ہے کبھی نگاہِ بد سے نہیں دیکھتا۔ ایسا کیوں ہے؟ اس لئے کہ اس کے دل میں یہ خیال پختہ عقیدہ کی شکل اختیار کر چکا ہے کہ بہن کے ساتھ جنسی تعلق جائز نہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اس لڑکی (یعنی بہن) کے حوالہ سے جنسی جذبہ کا خیال تک اس کے دل میں نہیں ابھرتا۔ اس لڑکے کے ہاتھوں اس لڑکی کی عصمت ہمیشہ محفوظ رہتی ہے۔ اس کے لئے نہ کسی قانون کی ضرورت ہے نہ کسی سپاہی کی حاجت۔ اس کا "تغیرِ نفس" خارجی اسباب کے بغیر اس لڑکی کی عصمت کا ضامن ہوتا ہے۔ یہ ہے جو "تغیرِ نفس" کرتا ہے۔ ایسا کچھ ادھر مشرق ہی میں نہیں ہوتا۔ مغرب میں بھی، جہاں کسی بالغ جوڑے کا باہمی رضامندی سے جنسی اختلاط نہ معاشرے کے نزدیک کوئی معیوب بات ہے، نہ قانون کی رو سے کوئی جرم، یہ "تغیرِ نفس" یہی نتیجہ پیدا کرتا ہے۔ کچھ سال اُدھر کا ذکر ہے، اخبارات میں امریکہ کے ایک جوڑے کا واقعہ شائع ہوا تھا جو آٹھ دس سال سے میاں بیوی کی حیثیت سے خوش و خرّم رہتا تھا اور اس کے نہایت خوبصورت بچے بھی تھے۔ ایک دن اتفاقاً اُن کے علم میں یہ بات آئی کہ وہ بہن بھائی ہیں۔

ہوا یوں کہ وہ بچے ہی تھے کہ لڑائی کے دوران ان کے ماں باپ مارے گئے۔ لڑکے کو کنیڈا کا کوئی فوجی اپنے ساتھ لے گیا اور لڑکی کو ایک امریکن اپنے ہمراہ لے آیا۔ دونوں بہن بھائی ایک دوسرے سے بالکل بے خبر تھے۔ اتفاق سے وہ لڑکا امریکہ جا پہنچا اور یونہی اس کی ملاقات اس لڑکی سے ہوگئی جو اب اس لڑکے کی طرح جوان ہوگئی تھی۔ ان دونوں کی باہمی رضامندی سے شادی ہوگئی۔ لیکن برسوں تک انہیں اپنی سابقہ زندگی کا علم نہ ہوا، کیونکہ بچپن کا کوئی واقعہ انہیں یاد نہ تھا۔ جس دن انہیں معلوم ہوا کہ وہ بھائی بہن ہیں، ان پر جو قیامت گذری اس کا اندازہ ان بیانات سے لگ سکتا ہے جو انہوں نے اخبارات کو دیئے۔ وہ دونوں روتے چیختے رہتے تھے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ کیا کریں۔ بہرحال پادریوں نے بڑی مشکل سے ان کی تسلّی تشفی کی اور وہ پھر بہن بھائی کی زندگی بسر کرنے لگ گئے۔ یہ کیا تھا؟ صرف اس عقیدہ کا نتیجہ کہ بہن بھائی میاں بیوی نہیں بن سکتے۔ قرآنِ کریم اس قسم کے "تغیرِ نفس" کو اصلاح کی بنیاد قرار دیتا ہے۔ (وہ ہر لڑکے کے دل میں یہ عقیدہ راسخ کر دیتا ہے کہ اس کی اپنی بیوی کے سوا، دنیا کی ہر لڑکی اس کی بہن ہے۔ جس کی طرف نگاہِ بد سے نہیں دیکھا جا سکتا۔ یوں معاشرہ سے فحاشی ختم ہو جاتی ہے)۔ خالی قوانین کی رو سے اس قسم کی اصلاح نہیں ہو سکتی۔

آپ نے غور فرمایا کہ نفسیاتی تغیر کو پسِ پشت ڈال کر قوانین کو مملکت کا مقصود و منتہیٰ قرار دینا قوم کو کہاں لے جاتا ہے؟ جہاں تک قوانین کا تعلق ہے آج بھی ان کی کوئی کمی نہیں۔ لیکن اس کے باوجود جو خرابیاں عام ہوتی جا رہی ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم "تغیرِ نفس" کے بغیر محض قوانین کی رو سے تغیرِ احوال کے درپے ہیں۔ خدا کہتا ہے کہ ایسا نہیں ہو سکتا۔ یہ حضرات کہتے ہیں کہ قوانین کا نام اسلامی رکھ دیجئے ایسا خود بخود ہو جائے گا! ہم یہ نہیں کہتے کہ قوانین کی ضرورت نہیں۔ ان کی بھی ضرورت ہے لیکن وہ مستثنیات کے لئے ہوتے ہیں اور ان سے معاشرہ کا نظم و نسق اور ربط و ضبط قائم رہتا ہے۔ لیکن اصلاحِ احوال، تغیرِ نفس کے بغیر ممکن نہیں۔

لیکن یہاں قوانین کے سلسلے میں بھی ایک عجیب چکر چلایا گیا ہے۔ پہلے یہ کہا گیا کہ اسلامی مملکت میں شخصی قوانین (پرسنل لاز) ہر فرقے کے الگ ہوں گے، حالانکہ اسلام میں پرسنل لاز اور پبلک لاز میں کوئی امتیاز ہی نہیں ہوتا۔ اب رہے پبلک لاز۔ تو ظاہر ہے کہ یہ لاز بہرحال ساری مملکت میں ایک ہی ہونے چاہئیں اور ہر ایک پر ان کا اطلاق یکساں۔ جب پوچھا گیا کہ پبلک لاز کا ایسا ضابطہ کس طرح مرتب ہو سکے گا جسے تمام فرقے متفقہ طور پر اسلامی تسلیم کر لیں تو جواب دیا گیا کہ کتاب و سنّت کی رو سے ایسا ضابطہ بن سکتا ہے۔ قریب بیس سال تک ہر حکومت کے خلاف یہ پروپیگنڈہ جاری رکھا گیا کہ یہ لوگ بدنیت ہیں۔ ملک میں اسلامی قوانین نافذ نہیں کرنا چاہتے۔ لیکن آخر کار انہیں اس کا اعتراف کرنا پڑا کہ:-

> کتاب و سنّت کی رُو سے کوئی ایسی تعبیر ممکن نہیں ہے جو پبلک لاز کے معاملے میں حنفیوں، شیعوں، اہلحدیثوں کے نزدیک متفق علیہ ہو۔
>
> (مودودی صاحب کا بیان۔ بحوالہ، ایشیا۔ ۲۳ اگست ۱۹۷۰ء)

یعنی ۲۰ سال تک یہ حضرات ایسا مطالبہ پیش کرتے رہے جو خود ان کے نزدیک بھی ناممکن العمل تھا۔ اور دنیا یہ دیکھ کر

محوِ حیرت ہے کہ اس کے بعد بھی آج تک اُسی مطالبے کو برابر دہرایا جا رہا ہے کہ ہیبلک لاز کا ضابطہ کتاب و سنت کے مطابق مرتب کرایئے۔ یعنی وہی مطالبہ جسے یہ خود ناممکن قرار دیتے ہیں۔

ہم نے جو کچھ اوپر کہا ہے، کہ یہ حضرات جنہوں نے مذہب کے نام پر تحریکِ پاکستان کی مخالفت کی تھی وہ یہاں آ کر کس کس قسم کی کوششوں میں مصروف ہیں، اس کا ملخص یہ ہے کہ یہ حضرات:۔

(۱) تغیرِ نفس کے بغیر محض قوانین کی رو سے تغیرِ احوال کا دعویٰ کر رہے ہیں جو خدا کے حتمی فیصلہ سے کے خلاف کھلا ہوا چیلنج ہے۔

(۲) اور اسلامی قوانین کا مطالبہ اس معیار کی رو سے مرتب کرانے کا مطالبہ کرتے ہیں جو خود ان کے نزدیک ناممکن ہے۔ یعنی ایسا ضابطہ خود مرتب کر کے نہیں دیتے کیونکہ یہ جانتے ہیں کہ ایسا ہو نہیں سکتا بلکہ حکومت سے اس کا مطالبہ کرتے ہیں تاکہ اس کے خلاف پروپیگنڈہ کرنے کے لئے حجت موجود رہے۔

اس کا نتیجہ ملک اور قوم کی وہ حالت ہے جس پر ملّت کا ہر دردمند دل خون کے آنسو بہاتا ہے، لیکن جس پر ان حضرات نے کبھی اظہارِ تأسّف تک نہیں کیا کیونکہ یہ تو ان کے منشا اور مقصد کے عین مطابق ہے۔ طلوع اسلام نے ان کی اس سکیم کو بھانپا اور جس طرح اس نے تحریکِ پاکستان کے خلاف ان کے ہر حربے کو بے نقاب کیا تھا یہاں بھی وہ ان کی ان تخریبی تدبیروں کی طرف سے قوم کو ہوشیار کرتا چلا آ رہا ہے۔ اور اس کی سزا بھی بھگت رہا ہے۔ ان کی سوچی سمجھی سکیم یہ تھی کہ لوگوں کے سامنے طلوع اسلام کو اس قدر گھناؤنی شکل میں پیش کیا جائے کہ ہر شخص اسے نفرت کی نگاہ سے دیکھے اور کوئی اس کی بات نہ سنے۔ آپ کسی اجنبی سے اجنبی شخص کے سامنے بھی طلوع اسلام کا نام لیجئے، وہ جھٹ سے کہہ دیگا کہ "ہاں! وہ پرویزی فرقے والے جو تین وقت کی نمازیں اور نو دن کے روزے کہتے ہیں۔ نہ حج کے قائل ہیں نہ زکوٰۃ کے۔ جو شانِ رسالت تک کے منکر ہیں۔ انہوں نے تو ایک نیا مذہب ایجاد کر رکھا ہے"۔ جب ان سے پوچھا جائے کہ آپ کو یہ کیسے معلوم ہوا تو جواب میں کہہ دیں گے کہ ساری دنیا یہ کہتی ہے۔ اور ساری دنیا سے مراد ان حضرات کے پروپیگنڈے کی وہ مشینری ہے جو ان جھوٹے افسانوں کو وضع کرتی اور بے پناہ روپے کے بل بوتے پر مسلسل پھیلاتی چلی آ رہی ہے۔ ان لوگوں کی اس سکیم کا نتیجہ یہ ہے کہ ہماری نوجوان نسل نے یہ کہنا شروع کر دیا ہے کہ جب یہاں برائیاں بھی ختم نہیں ہوئیں اور ہر قسم کی خرابیاں بڑھتی چلی جا رہی ہیں، اور جن اسلامی قوانین کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ ان کی روک تھام کر سکیں گے وہ قوانین مرتب ہی نہیں ہو سکتے۔ تو پھر ہندوستان سے کٹ کر ایک الگ مملکت بنانے کی ضرورت کیا تھی؛ جب یہ خیال اور شدّت اور وسعت اختیار کر گیا تو اس کا جو نتیجہ ہوگا وہ ظاہر ہے! اور اسی نتیجے تک پہنچانا ان حضرات کا مقصود ہے جن کی مخالفت کے علی الرغم پاکستان وجود میں آگیا تھا۔

مرکزی نکتہ یہ سامنے آیا کہ "تغیرِ نفس" کے بغیر اصلاحِ احوال ناممکن ہے۔ سوال یہ ہے کہ "تغیرِ نفس" سے مراد کیا ہے؛ اس بات کے سمجھ لینے سے سارا مسئلہ حل ہو جاتا ہے۔

سیکولر تصوّرِ حیات میں اجتماعی زندگی کے لئے صرف قوانین ہوتے ہیں جنہیں افرادِ مملکت خود وضع کرتے اور عند الضرورت ان میں ترمیم و تنسیخ کرتے رہتے ہیں۔ وہ ان قوانین کو نافذ کرنے کے لئے ادارے قائم کرتے ہیں۔ پولیس، عدالتیں، جیل خانے۔

اور انتہائی ضرورت کے وقت فوج ——— یہ سب اہتمامات قوانین کی پابندی کرانے کے لئے ہوتے ہیں۔ اس کے باوجود دنیا میں جس قدر اخلاقی برائیاں عام ہوتی اور جرائم پھیلتے چلے جا رہے ہیں وہ ڈھکی چھپی بات نہیں۔ علامہ اقبالؒ کے زمانے میں یہ واویلا نچلے سُروں میں تھا لیکن اب یہ ساتویں سُر سے بھی آگے بڑھ گیا ہے۔ اس میں نہ قوانین کی چنداں خرابی ہے، نہ ان کی پابندی کرانے والے اداروں کے نقائص و اسقام کی۔ اس کی اصلی وجہ یہ ہے کہ مجرد قوانین کی رو سے انسانوں کی زندگی میں تبدیلی آ نہیں سکتی۔

قرآنی تصورِ حیات کی رُو سے وحی کی وساطت سے کچھ مستقل اقدار دی گئی ہیں جن کی پابندی سے نفسِ انسانی میں تغیر واقع ہو جاتا ہے۔ ان اقدار کو صحیح تعلیم و تربیت سے، دل کی گہرائیوں میں اس طرح راسخ کیا جاتا ہے کہ ان کی پابندی نفسِ انسانی کا اسی طرح تقاضا بن جاتی ہے جس طرح (مثلاً) سانس لینا جسمانی زندگی کا تقاضا ہے۔ حضور نبی اکرمؐ کے متعلق ارشاد ہے کہ:
يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيْهِمْ (2/129) یعنی حضورؐ کا فریضۂ حیات یہ تھا کہ:-

(۱) وحیٔ خداوندی کو لوگوں کے سامنے پیش کیا جائے۔ (۲) کتاب و حکمت کی تعلیم دی جائے۔

(۳) اور اس طرح لوگوں کا "تغیرِ نفس" کیا جائے۔

یعنی "تغیرِ نفس" کا ذریعہ ایسی تعلیم ہے جس میں قوانین و اقدارِ خداوندی کی غرض و غایت اور ان کا منتہیٰ و مقصود اور اس انداز سے دلنشیں کرایا جائے کہ اس سے انسان کی نگاہوں کا زاویہ بدل جائے۔ اس کی تطہیرِ فکر و نظر ہو جائے۔ اس میں نفسیاتی تبدیلی واقع ہو جائے۔ یہی وہ نفسیاتی تبدیلی ہو گی جس سے معاشرہ میں اصلاح ہو جائے گی۔ یہ حقیقت ہے جس کے متعلق اقبالؒ نے کہا ہے:؎

فاش گویم آنچہ در دل مضمر است ایں کتابے نیست چیزے دیگر است

چوں بجاں در رفت، جاں دیگر شود جاں چوں دیگر شد، جہاں دیگر شود

طلوعِ اسلام کے سامنے یہی قرآنی حقیقت تھی جس کی رُو سے اس نے تشکیلِ پاکستان کے بعد سب سے پہلے یہ آواز بلند کی کہ اگر ہم اس خطۂ ارض کا استحکام اور اس میں اسلامی مملکت کا قیام چاہتے ہیں تو اس کے لئے کرنے کا بنیادی کام یہ ہے کہ قوم کی آنے والی نسلوں کی تعلیم قرآنی خطوط پر کی جائے۔ ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ یہ واضح کیا جائے کہ ہم کس طرح شروع ہی سے اس مسئلہ کی اہمیت کی طرف ابنائے قوم کی توجہ منعطف کراتے چلے آ رہے ہیں۔ تشکیلِ پاکستان کے بعد تیسرے یومِ آزادی کی تقریب (منعقدہ ۱۴ اگست ۱۹۵۰ء) پر ہم نے حالات کا محاسبہ کرنے کے بعد قوم سے جو کچھ کہا تھا اُسے بلفظہٖ درجِ ذیل کیا جاتا ہے۔

ہمارے نزدیک، اصلاح کی وہی صورت ہے جو قرآن نے داستانِ بنی اسرائیل میں نہایت حسین انداز میں بیان فرمائی۔ بنی اسرائیل کی وہی حالت ہو چکی تھی جو آج ہماری ہے۔ مدتوں کی غلامی نے ان کے تمام درخشندہ جوہر سلب کر لئے تھے اور افسردگی اور دنائت کی تمام خرابیاں ان میں پیدا ہو چکی تھیں۔ صاحبِ ضربِ کلیمؑ کے یدِ بیضا کی چمک انہیں فرعون کی غلامی سے نکال کر ایک آزاد خطۂ زمین میں لے آئی تھی۔ لیکن خطۂ زمین کے مل جانے سے ان کی سیرتوں میں کوئی تبدیلی پیدا نہ ہو سکی۔ ایک چھوڑ تین تین پیغمبر ان کے اندر موجود تھے۔ حضرت موسیٰؑ، حضرت ہارونؑ اور طور کی وادیوں میں حضرت شعیبؑ۔ لیکن وہ قوم جہاں تھی وہیں رہی۔ چنانچہ حضرت موسیٰؑ سے کہہ دیا گیا کہ انہیں ان کے حال پر چھوڑ دو۔ صرف اتنا انتظام کر دو کہ کوئی بیرونی خطرہ اس سرزمین کی تخریب کا باعث نہ ہو جائے۔ اس دوران میں قوم کی نئی نسلوں کو اپنے ہاتھ میں لو۔ ان کی تربیت اپنے انداز سے کرو۔ چنانچہ ہوا یہ کہ ادھر مرورِ زمانہ سے یہ بوسیدہ ہڈیاں رفتہ رفتہ ختم ہوتی گئیں اور

اتنے میں وہ نوجوان تیار ہو گئے جنہیں خاص انداز میں پروان چڑھایا گیا تھا۔ یہ شاہین بچے ابھرے اور ایک ہی جھپٹے میں اس ارض موعود پر قابض ہو گئے جن میں ان کے بڑے بوڑھوں کو بڑے بڑے دیو نظر آیا کرتے تھے۔ لہٰذا پاکستان والوں کیلئے کرنے کا کام یہ ہے کہ وہ اپنی آنے والی نسل کی صحیح تعلیم کا انتظام کریں کہ تعلیم ہی وہ قالب تیار کرتی ہے جس میں سیرتیں ڈھلا کرتی ہیں۔ آج اس بات پر نہ رو دیجئے کہ موجودہ اوپر کا طبقہ سیرت و صلاحیت کے اعتبار سے کتنا پست ہے؛ نہ ہی اس پر کہ نیچے کا طبقہ ضبط و انضباط کی رو سے کس قدر خام ہے۔ رو دیئے اس بات پر کہ قوم کی آنے والی نسل کی صحیح تعلیم و تربیت کا کوئی انتظام نہیں۔ حکومت کے نظم و نسق کے ہر دوسرے گوشے کی خامیوں کو برداشت کر لیا جا سکتا ہے لیکن آنیوالی نسل کی صحیح تعلیم و تربیت سے متعلق گوشے کی خامیوں کو کسی صورت میں بھی گوارا نہیں کیا جا سکتا۔ اس لئے کہ اگر وہ نسل بھی ہماری موجودہ نسل کے نقشِ قدم پر چلتی رہی تو پھر یہ سرزمین ہماری ہزار آرزوؤں کے باوجود کبھی محفوظ نہیں رہ سکے گی۔ ہم، لوگوں سے یہ شکایت بھی سنتے ہیں کہ ہماری حکومت تعلیم کی طرف پوری توجہ نہیں دے رہی۔ لیکن ان کی شکایت کا مطلب صرف اس قدر ہوتا ہے کہ حکومت نے کافی تعداد میں اسکول نہیں کھولے یا زیادہ سے زیادہ یہ کہ اسکولوں میں پڑھائی اچھی نہیں ہوتی۔ جو کچھ ہم کہہ رہے ہیں وہ یہ نہیں کہ آپ قریہ قریہ میں اسکول کھول دیجئے اور ہر اسکول کا نتیجہ سو فیصد دکھا دیجئے۔ اگر ایسا کر دیا جائے تو بھی ہمارے نزدیک یہ صحیح تعلیم نہیں کہلا سکتی۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمارے ہاں ابھی تک خواندگی (LITERACY) اور تعلیم (EDUCATION) میں فرق ہی نہیں کیا جاتا۔ ہمارے ہاں خواندگی ہی کو تعلیم سمجھا جاتا ہے۔ تعلیم کیلئے خواندگی ضروری ہے لیکن خواندگی تعلیم نہیں ہو سکتی۔ زندگی ہمیشہ اقدار (VALUES) کے تابع چلتی ہے۔ اقدار ہی اس کا نصب العین متعین کرتی ہیں۔ جس قسم کی اقدار انسان کے سامنے ہونگی، اسی قسم کی اس کی زندگی ہو گی، اور جس قدر ان اقدار سے کسی کو عشق ہو گا اسی قدر سعی و کاوش اور جذب و انہماک سے ان کے حصول اور تحفظ کیلئے انسان سرگرمِ عمل رہے گا۔ تعلیم، زندگی کی اقدار متعین کرتی ہے۔ جس قسم کی تعلیم ہو گی اسی قسم کی اقدار متعین ہو جائیں گی۔ صحیح تعلیم سے مفہوم یہ ہے کہ نوجوانوں کے سامنے زندگی کی صحیح اقدار لائی جائیں۔ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق جب فرمایا کہ یُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ۔ (کہ وہ انہیں نظامِ زندگی اور محکماتِ حیات کی تعلیم دیتا ہے) تو اس سے مراد نوشت و خواند کی تعلیم نہ تھی بلکہ وہی تعلیم تھی جو انسان کے سامنے زندگی کی صحیح اقدار متعین کرتی ہے اور جس کا نتیجہ انسانی صلاحیتوں کی بالیدگی (یُزَكِّيهِمْ) ہوتا ہے۔ ہمارے معاشرہ میں آج جو جو خرابیاں پیدا ہو چکی ہیں، اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ہمارے سامنے زندگی کی صحیح اقدار نہیں۔ ہمارے معاشرہ میں زندگی کی سب سے بڑی قدر انفرادی خوشحالی اور حصولِ اقتدار ہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ ہم لٹیروں کا گروہ یا حیوانوں کا گلہ بن چکے ہیں۔ قرآن کا سب سے بڑا اعجاز یہ ہے کہ وہ زندگی کی صحیح اقدار سامنے لے آتا ہے اور یہی قدار سیرت کی بنیادیں بن جاتی ہیں۔ چونکہ قرآن وہ اقدار متعین کرتا ہے جس سے انسانیت کی پوری پوری نشو و نما ہو جاتی ہے، اس لئے جس قسم کی سیرت ان اقدار کی بنیادوں پر متشکل ہوتی ہے، اس کی نظیر کہیں اور نہیں مل سکتی۔ یہ ظاہر ہے کہ رقبہ اور صنعت و حرفت کے اعتبار سے پاکستان دنیا کے بہت سے خطوں سے پیچھے ہے اور جس رفتار سے دنیا ترقی کر رہی ہے اس کے پیشِ نظر ہم مغربی اقوام کے ہم پلہ نہیں ہو سکیں گے۔ اس کمی کو پورا کرنے کے لئے بلکہ ان سے آگے نکل جانے کیلئے ہمارے پاس ایک دوسرا میدان ہے اور وہ میدان ہے ان اقدار کا جن کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے۔ یہ اقدار کسی اور فلسفۂ زندگی میں نہیں مل سکتیں۔ اس لئے جو کیریکٹر ان اقدار کے قالب میں ڈھلے گا اس کی قوت کا جواب دنیا میں اور کہیں نہیں مل سکے گا۔ یہ ہے وہ میدان جس میں نہ صرف یہ کہ ہم اپنی موجودہ خامیوں کو رفع کر سکیں گے بلکہ مغرب کی ترقی یافتہ اقوام سے بھی آگے بڑھ جائیں گے۔

تقسیم کے بعد قوم کو "قانونِ شریعت کو نافذ کرو" کا سلوگن دیا گیا۔ عوام کے تقلیدی ذہن نے اسے بڑا خوش آئند

سمجھا اور یہ سلوگن بڑا مقبول ہو گیا۔ اس سلوگن کے پیچھے جو جذبہ محرکہ تھا وہ انتخابات کے قریب آنے سے بے نقاب ہوتا چلا گیا لیکن اگر ایسا نہ بھی ہوتا تو بھی یہ حقیقت غور طلب تھی کہ قانونِ شریعت سے مراد کیا ہے اور اس کے نفاذ سے حاصل کیا ہوگا؟ اس چیز کو آج تک کسی نے متعین کر کے نہیں بتایا اس لئے کہ اس سلوگن کو پیش کرنے والے اس کاروباری راز (TRADE SECRET) کو عام نہیں کرنا چاہتے۔ وہ کہتے یہ ہیں کہ پہلے ہمیں برسر اقتدار کر دو پھر ہم بتائیں گے کہ قانونِ شریعت کیا ہوتا ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ قانونِ شریعت سے مراد وہ تعزیری سزائیں ہو سکتی ہیں جو بعض جرائم کی پاداش میں نافذ کی جا سکتی ہیں، یا نکاح، طلاق، وراثت وغیرہ سے متعلق مسائل۔ ذرا غور کیجئے کہ اگر ان قوانین کو نافذ بھی کر دیا جائے تو اس سے کونسی اصلاح کی صورت پیدا ہو جائیگی؟ آج بھی تو (چند مستثنات کے سوا) وہ تمام کام جرائم شمار کئے جاتے ہیں جنہیں ہماری شریعت جرائم قرار دیتی ہے اور ان جرائم کی سزائیں بھی مقرر ہیں۔ ان سزاؤں کی نوعیت میں کچھ فرق سہی لیکن بہر حال سزائیں تو موجود ہیں۔ ان سزاؤں کی موجودگی سے اصلاحِ حال کی کوئی صورت پیدا نہیں ہو رہی۔ اس لئے اگر ان کی جگہ شرعی سزائیں نافذ کر دی جائیں تو پھر کونسی تبدیلی پیدا ہو جائے گی۔ بالآخر ایسے ممالک بھی تو ہیں جہاں اس قسم کا قانونِ شریعت نافذ ہے۔ وہاں کے معاشرتی حالات ہم سے کسی صورت میں بہتر نہیں۔ قرآن ایک نظامِ زندگی متعین کرتا ہے۔ اور یہ نظام متشکل نہیں ہو سکتا تاوقتیکہ قوم کے دل و دماغ کی تعمیر ان خطوط پر نہ ہو جو اس نظام کے قیام اور بقاء کے ذمہ دار بن سکتے ہیں۔ اور یہ خطوط تعلیم ہی کے ذریعہ سے نمایاں ہو سکتے ہیں۔ لہٰذا اصل مطالبہ صحیح قرآنی تعلیم کے اجرا، کا ہونا چاہیئے۔ پھر سن رکھیئے کہ قرآنی تعلیم سے مفہوم فنِ تجوید یا قرآن کی تفاسیر پڑھانا نہیں۔ اس تعلیم سے مراد یہ ہے کہ قوم کے نوجوانوں کے سامنے وہ اقدار لائی جائیں جو قرآن متعین کرتا ہے۔ تاریخی شواہد اور آفاقی حوادث کی روشنی میں یہ بتایا جائے کہ یہ اقدار کس طرح انسانیت کی نشو و ارتقاء کا موجب بن سکتی ہیں۔ اور اس سے مختلف اقدار کیوں ایسے نتائج پیدا نہیں کر سکتیں۔ اگر ہم نے اس قسم کی تعلیم کا انتظام کر لیا تو نہ صرف یہ کہ پاکستان کا خطہ محفوظ رہ جائیگا بلکہ ہو سکتا ہے کہ نوعِ انسانی کی امامت اسی خطہ کے رہنے والوں کو نصیب ہو جائے۔

اگر قوم صحیح معنوں میں موجودہ صورتِ حالات میں تبدیلی کی خواہاں ہے تو اس کیلئے کرنے کا کام ایک ہی ہے اور وہ یہ کہ اربابِ نظم و نسق کو اس بات پر مجبور کر دیا جائے کہ وہ ملک میں صحیح قرآنی تعلیم رائج کریں جس سے صحیح اسلامی نظام قائم ہو سکے۔ قوم نے اڑتیس سال بے معنی کوششوں میں ضائع کر دیئے۔ اگر ہم آج بھی اپنی کوششوں کو اس ایک نقطہ پر مرکوز کر لیں تو ہماری بگڑی کو بننے کچھ دیر نہیں لگے گی۔ اگر قوم اس ضرورت سے متفق ہے تو وہ حکومت سے صحیح تعلیم کا مطالبہ کرے اور اگر حکومت اس ضرورت کا احساس رکھتی ہے لیکن اسے یہ معلوم نہیں کہ یہ کام کس طرح کیا جائے تو اس باب میں ہم ہر طرح کی معاونت کے لئے تیار ہیں۔ سب سے پہلا کام مرکز میں ایک ایسی مجلس (کمیٹی) کا تعین ہے جو اس مسئلہ کی جانچ پڑتال کرے، اور اس کے بعد ملک کے لئے ایک مکمل نصابِ تعلیم تجویز کرے ــــ لیکن اگر قوم نے اس بنیادی ضرورت کا احساس نہ کیا اور اربابِ حکومت نے اپنے پیشِ نظر صرف یہی رکھا کہ عوام کو کس طرح خوش فہمیوں میں مبتلا رکھا جا سکتا ہے تو پھر زندہ سے زیادہ ہوگا یہ کہ ایک طرف سرکاری مدارس سے کلرک پیدا ہوتے رہیں گے جو صرف روٹی کمانے کیلئے مشینوں کی جگہ کام میں لگائے جائیں گے اور دوسری طرف مذہبی علوم کے دارالعلوم کھلیں گے جن میں وہ لوگ پیدا ہونگے جنہیں روٹی کمانے کا سلیقہ بھی نہیں آئیگا۔ اور پاکستان کی حالت یہ ہوگی کہ دنیا کے دوسرے "اسلامی ممالک" کی طرح اقوامِ مغرب کے رحم و کرم پر دنیا کے نقشے پر موجود رہیگا' اور جب ان کی سیاسی مصلحتوں کا تقاضا ہوگا اس نقشہ سے اس کا نام بھی مٹا دیا جائیگا۔ وَيٰلَيْتَنِيْ مِتُّ قَبْلَ هٰذَا وَكُنْتُ نَسْيًا مَّنْسِيًّا۔"

(طلوعِ اسلام۔ اگست ۱۹۵۰ء۔ لمعات)

اور اسے ہم بار بار دہراتے رہے ــــ ہم سمجھتے ہیں کہ قریب اڑتیس سال کے بعد بھی اس محاکمہ میں نہ کسی تبدیلی کی ضرورت ہے نہ اضافہ کی۔ بجز اس کے کہ: ع

آہ جو قطرہ نہ نکلا تھا سو طوفاں نکلا

شریعت اسلامی اور سونے کے زیورات

از شاہد عادل۔

سونا ایک قیمتی دھات ہے اور اسی وجہ سے زمانۂ قدیم سے زرِ مبادلہ کے طور پر استعمال ہوتا چلا آ رہا ہے۔ اس سے جو سکہ بنایا جاتا، وہ ساری دنیا میں اشرفی کے نام سے مشہور تھا۔ جس کے پاس جتنی زیادہ اشرفیاں ہوتیں، اسے اتنا بڑا دولت مند سمجھا جاتا تھا۔ ان دولت مندوں کے پاس سرمایہ انہی اشرفیوں کی صورت میں جمع رہتا تھا۔ اسلام نے اگرچہ سرمایہ داری نظام کا خاتمہ کر دیا لیکن سونے کی زرِ مبادلہ والی حیثیت کو باقی رکھا یہ حیثیت اسے آج تک حاصل ہے، بلکہ اس جدید دور میں اس کی اس حیثیت میں کچھ مزید اضافہ ہو چکا ہے۔ اور آج مختلف ممالک کی ساکھ کا دارومدار اس کے سونے کے محفوظ ذخائر سے لگایا جاتا ہے۔

سونا اور سرمایہ داری کا نظام

مال و دولت کو جمع کرنا سرمایہ داری نظام کا خاصا رہا ہے۔ اسلام نے اس عمل کو معیوب قرار دیا ہے۔ ارشاد خداوندی ہے

وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةٍ ﴿١﴾ الَّذِي جَمَعَ مَالًا وَعَدَّدَهُ ﴿٢﴾ يَحْسَبُ أَنَّ مَالَهُ أَخْلَدَهُ ﴿٣﴾ كَلَّا ۖ لَيُنبَذَنَّ فِي الْحُطَمَةِ ﴿٤﴾ (سورۃ الھمزۃ = ۱-۴)

ترجمہ:۔ ہر غیبت کرنے والے، طعنہ دینے والے کے لئے ہلاکت ہے جو مال کو جمع کرتا ہے اور اسے گنتا رہتا ہے۔ وہ خیال کرتا ہے کہ اس کا مال اسے سدا رکھے گا۔ ہرگز نہیں، وہ اللہ کی بھڑکائی ہوئی آگ میں پھینکا جائے گا۔

اسلام نے دولت کے کمانے پر تو کوئی پابندی عائد نہیں کی۔ لیکن اس کمائی ہوئی دولت کو عیش و عشرت پر اڑانے کی اجازت نہ دی۔ بلکہ حکم دیا کہ اپنی ضرورت سے زائد آمدنی کو، اپنے حاجت مند بھائیوں کی ضروریات پوری کرنے کے لئے۔ صرف کر دیا جائے اور جو مسلمان ایسا نہیں کریں گے اور بخل سے کام لیں گے، تو ان کی دولت قیامت کے دن، طوق بنا کر ان کے گلے میں ڈال دی جائے گی۔ ارشاد خداوندی ہے:۔

وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِينَ يَبْخَلُونَ بِمَا آتَاهُمُ اللَّهُ مِن فَضْلِهِ هُوَ خَيْرًا لَّهُم ۖ بَلْ هُوَ شَرٌّ لَّهُمْ ۖ سَيُطَوَّقُونَ مَا بَخِلُوا بِهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ ۗ

(سورہ آل عمران – ۱۸۰)

ترجمہ :۔ اور جو لوگ اس چیز پر بخل کرتے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے انکو اپنے فضل سے دی، وہ یہ خیال نہ کریں کہ یہ بخل ان کے حق میں بہتر ہے بلکہ یہ ان کے حق میں بُرا ہے۔ قیامت کے دن وہ مال طوق بنا کر ان کے گلوں میں ڈالا جائے گا۔ جس میں وہ بخل کرتے تھے،

اس آیۂ مبارکہ میں گلے کے طوق کو جو زیورات کی ایک معروف شکل ہے، کو ایک نہایت ہی ناپسندیدہ صورت میں پیش کیا گیا ہے۔ لیکن مقام افسوس ہے کہ بعد میں اس قرآن کو ماننے والوں نے اس ناپسندیدہ صورت کو اپنے لئے باعثِ زینت بنا لیا۔

سونے کے زیورات

اس زمانے میں، سونے کے زیورات بھی دولت جمع کرنے کا ایک معروف طریقہ تھا۔ ان زیورات سے عام طور پر دو کام لئے جاتے تھے۔ یعنی ایک تو اس طریقے سے دولت جمع کی جاتی تھی اور دوسرے ان کے ذریعے، اپنی دولت اور ثروت کے دکھلاوے کا کام لیا جاتا تھا۔ اور مزے کی بات یہ ہے کہ آج بھی ان سے یہی دونوں کام لئے جاتے ہیں۔ آج بھی جب کسی تقریب میں کوئی امیر عورت، لاکھوں روپے کا زیور پہن کر طرح طرح سے ان کی نمائش کرتی ہے تو اس وقت غریب عورتوں کے دلوں پر جو کیفیت گزرتی ہے، اس کا اندازہ کرنا مشکل نہیں، یہاں تک کہ ان غریب عورتوں کے لواحقین یہ صورتِ حال دیکھ کر پریشان ہو جاتے ہیں اور اپنی عورتوں کو سونے کے زیورات مہیا کرنے کے لئے ناجائز ذرائع اختیار کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ ہمارے معاشرے میں رشوت کی لعنت کے رواج پا جانے کی ایک اہم وجہ بھی سونے کے زیورات ہیں۔

مسلم معاشرے میں سونے کے زیورات

سونے کے زیورات کی وجہ سے معاشرے میں جو سماجی برائیاں جنم لیتی ہیں وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر سے پوشیدہ نہیں تھیں۔ قرآن مجید میں بھی اس سلسلے میں اصولی تعلیمات نازل فرما دی گئی تھیں، جن کی روشنی میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمان مردوں اور عورتوں، دونوں کے لئے سونے کے زیورات کا استعمال ناجائز قرار دے دیا۔ اس بارے میں احادیث کی معتبر کتابوں میں کوئی ایک درجن کے قریب ارشاداتِ رسولؐ موجود ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام سے پہلے، زمانۂ جاہلیت میں عربوں میں سونے کے زیورات پہننے کا عام رواج تھا جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف طریقوں سے ختم کر دیا۔ آپ کے ان ارشادات اور مختلف اقدامات کا اثر اتنا گہرا تھا کہ آج بھی بہت سے عرب ممالک میں سونے کے زیورات کا رواج نہ ہونے کے برابر ہے، بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ ان کا رواج صرف ہمارے ملک تک محدود ہے تو غلط نہ ہوگا۔ ہندو معاشرہ کہ جس سے ہم نے یہ رسم مستعار لی تھی، اسے کبھی کا ترک

کم چکا ہے اور آج دنیا میں پاکستان ہی واحد ملک ہے جہاں خالص سونے کے زیورات کا رواج باقی رہ گیا ہے۔

راقم کو یہ یقین ہے کہ اگر عامۃ الناس کے سامنے اس بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات پیش کئے جاتے تو ہمارے ہاں بھی صورتِ حال مختلف ہوتی۔

سونے کے زیورات اور حدیث

اس کمی کو پورا کرنے کے لئے چند ارشاداتِ نبوی قارئین کی خدمت میں پیش کئے جاتے ہیں۔ جن سے یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کتنی سختی سے ان زیورات کے استعمال سے منع فرمایا تھا۔ اختصار کو مدنظر رکھتے ہوئے ہم یہ احادیث، حدیث شریف کی صرف ایک مستند کتاب سنن ابوداؤد سے پیش کر رہے ہیں۔ حدیث کی اس معتبر کتاب کی یہ خصوصیت ہے کہ اگر کسی حدیث میں کوئی کمزوری ہو تو اس کے ساتھ ہی نشان دہی کر دی جاتی ہے۔ جن تین احادیث کو آئندہ سطور پیش کیا جا رہا ہے وہ امام ابوداؤد سمیت تمام آئمہ حدیث کے نزدیک صحیح ہیں۔

پہلی حدیث

عَنْ اُخْتٍ لِحُذَیْفَۃَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ یَا مَعْشَرَ النِّسَاءِ اَمَا لَکُنَّ فِی الْفِضَّۃِ مَا تَحَلَّیْنَ بِہٖ اَمَا اَنَّہٗ لَیْسَ مِنْکُنَّ اِمْرَاَۃٌ تَحَلّٰی ذَھَبًا تُظْھِرُہٗ اِلَّا عُذِّبَتْ بِہٖ

(سنن ابوداؤد جلد دوم صفحہ ۲۱۰ مصری ایڈیشن باب مَاجَاءَ فِی الذَّھَبِ لِلنِّسَاءِ)

ترجمہ: حضرت حذیفہ کی ایک بہن سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اے عورتوں کی جماعت، تم چاندی کے زیور کیوں نہیں پہنتی۔ کیونکہ تم میں سے جو عورت سونے کے زیورات پہنے گی اور اس کی نمائش کرے گی تو قیامت کے دن، اسی زیور سے اسے عذاب دیا جائے گا۔

دوسری حدیث

اَنَّ اَسْمَاءَ بِنْتَ یَزِیْدَ حَدَّثَتْہُ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ اَیُّمَا امْرَاَۃٍ تَقَلَّدَتْ قِلَادَۃً مِنْ ذَھَبٍ قُلِّدَتْ فِیْ عُنُقِہَا مِثْلَہٗ مِنَ النَّارِ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ وَاَیُّمَا امْرَاَۃٍ جَعَلَتْ فِیْ اُذُنِہَا خُرْصًا مِنْ ذَھَبٍ جُعِلَ فِیْ اُذُنِہَا مِثْلُہٗ مِنَ النَّارِ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ (ایضاً)

ترجمہ:۔ حضرت اسماء بنت یزید نے روایت بیان کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس عورت نے بھی گلے میں گلوبند پہنا، تو قیامت کے دن اسے ویسا ہی آگ کا گلوبند پہنایا جائے گا اور جو عورت بھی اپنے کانوں میں سونے کی بالیاں پہنے گی تو قیامت کے دن اسی کی مانند، اس کے کانوں میں آگ ڈالی جائے گی۔

تیسری حدیث

عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ قَالَ مَنْ اَحَبَّ اَنْ يُّحَلِّقَ حَبِيْبَهٗ حَلْقَةً مِّنْ نَارٍ فَلْيُحَلِّقْهُ حَلْقَةً مِّنْ ذَهَبٍ وَمَنْ اَحَبَّ اَنْ يُّطَوِّقَ حَبِيْبَهٗ طَوْقًا مِّنْ نَارٍ فَلْيُطَوِّقْهُ طَوْقًا مِّنْ ذَهَبٍ وَمَنْ اَحَبَّ اَنْ يُّسَوِّرَ حَبِيْبَهٗ سَوَارًا مِّنْ نَارٍ فَلْيُسَوِّرْهُ سِوَارًا مِّنْ ذَهَبٍ وَلٰكِنْ عَلَيْكُمْ بِالْفِضَّةِ فَالْعَبُوْا بِهَا (ایضاً)

ترجمہ:۔ حضرت ابوہریرہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم میں سے جو یہ پسند کرتا ہے کہ اپنی محبوبہ کے گلے میں آگ کا طوق ڈالے تو پھر وہ بے شک اسے سونے کا گلوبند پہنا سکتا ہے اور جو یہ پسند کرتا ہے کہ اپنی محبوبہ کو آگ کی انگوٹھی پہنائے تو پھر وہ بے شک اسے سونے کی انگوٹھی پہنا سکتا ہے اور تم میں سے جو پسند کرتا ہے کہ اپنی محبوبہ کو آگ کے کنگن پہنائے تو پھر وہ اسے سونے کے کنگن پہنا سکتا ہے۔ تم پر لازم ہے کہ چاندی کے زیور استعمال میں لاؤ اور ان سے جسطرح چاہو، زینت حاصل کرو۔

اسی مضمون کی اور بھی بہت سی احادیث ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ شریعت اسلامی نے سونے کے زیورات پر پابندی لگا دی۔ حدیث کے ایک دوسرے مجموعے، مشکوٰۃ، میں کوئی ایک درجن ایسی احادیث ملتی ہیں لیکن ہم نے اختصار کو مدنظر رکھتے ہوئے ان تین احادیث پر اکتفا کیا ہے جو تمام آئمہ حدیث کے نزدیک صحیح ہیں۔ جو صاحب زیادہ تفصیلات چاہیں وہ مشکوٰۃ شریف، جس کے کئی اردو ترجمے دستیاب ہیں، میں ان احادیث کا مطالعہ کر سکتے ہیں۔

ضعیف احادیث سے جواز

جو اہل علم سونے کے زیورات کے جائز ہونے کے قائل ہیں، انہوں نے ان صحیح احادیث کو تو کبھی بیان نہیں کیا، لیکن اپنی تائید میں ایک ایسی روایت پیش کرتے ہیں جو آئمہ حدیث کے نزدیک بالاتفاق ضعیف ہے۔ اس حدیث کا مضمون یوں ہے۔

"حضرت موسیٰ اشعری روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میری امت کے مردوں کے لئے سونے اور ریشم کا استعمال حرام ہے لیکن مسلمان عورتوں کے لئے یہ جائز ہے۔"

بلاشبہ یہ حدیث احادیث مبارکہ کے مختلف مجموعوں میں موجود ہے لیکن بڑے بڑے آئمہ حدیث نے اسے صحیح تسلیم کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ فن حدیث کے مشہور امام ابوحاتم نے اس بناء پر اس حدیث کو ضعیف قرار دیا ہے کہ اس کے راوی سعید بن ابی ہند کی، حضرت موسیٰ اشعری سے کبھی ملاقات تک نہ ہوئی تھی۔ اسی طرح امام دارقطنی نے بھی یہ تصریح کی ہے کہ سعید بن ابی ہند نے حضرت ابوموسیٰ اشعری سے کوئی حدیث بھی نہیں سنی تھی۔ حدیث کے ایک اور امام، امام ابن حبان نے بھی اسی بناء پر اس حدیث کو ضعیف قرار دیا ہے۔

اتنے جلیل القدر آئمہ حدیث کی تحقیق کے بعد، اس حدیث کو تسلیم تو نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن اسے اگر محض دلیل کی خاطر تسلیم بھی کر لیا جائے تو مذکورہ بالا صحیح احادیث کے مقابلے میں اس حدیث کا مقام سونے کے زیورات کی حرمت کے ابتدائی درجے کا ہوگا۔ جس کے مطابق ابتداء میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سونے کا استعمال مردوں کے لئے ناجائز قرار دیا ہوگا اور بعد میں بتدریج عورتوں کے لئے بھی اسے حرام قرار دے دیا۔

مختصر یہ کہ شریعت اسلامی میں سونے کے زیورات کا استعمال مردوں اور عورتوں دونوں کے لئے جائز نہیں۔ آج ہمارے معاشرے میں، ان زیورات کی وجہ سے جو سماجی خرابیاں پیدا ہو رہی ہیں اور جن کے مضر اثرات کی وجہ سے خود ہندو معاشرہ کہ جس سے ہم نے یہ رسم مستعار لی تھی، نے ان کے استعمال پر پابندی لگا دی ہے۔ ان کے اس اقدام سے یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ اس بارے میں شریعت اسلامی کے احکامات انسانی فطرت کے عین مطابق ہیں۔ امید ہے کہ ہمارے علماء مذکورہ بالا ارشادات نبوی کو سامنے رکھتے ہوئے اس رسم بد کو پاکستانی معاشرے سے ختم کرنے کے لئے جدوجہد کریں گے۔

مطالب الفرقان جلد ششم

اس میں سورۃ الاعراف کی آیات (۱۵۹ تا ۲۰۶)، سورۃ انفال کی کل آیات (۱ تا ۷۵)، سورۃ توبہ کی کل آیات (۱ تا ۱۲۹) سورۃ یونس کی کل آیات (۱ تا ۱۰۹) اور سورۃ ھود کی کل آیات (۱ تا ۱۲۳) آگئی ہیں، جو بیشتر مشتمل ہیں، حضرات انبیاء سابقہ کے کوائف حیات اور اقوام گذشتہ کے نہایت عبرت خیز واقعات پر، جو احباب سلسلۂ مطالب الفرقان کا مطالعہ کر چکے ہیں وہ جانتے ہیں کہ تصریف آیات کے اصول کے مطابق جس طرح قرآن مجید کی تفسیر، ان مجلدات میں پیش کی جارہی ہیں اس سے قرآنی حقائق کسطرح نکھر کر سامنے آجاتے ہیں۔

یہ جلد اعلیٰ درجہ کے سفید کاغذ کے (۴۳۶) صفحات پر پھیلی ہوئی ہے
کتابت، طباعت، جلد، سابقہ جلدوں کے معیار کے مطابق، عمدہ اور دلکش
قیمت فی جلد -/۷۵ روپے۔ محصول ڈاک -/۸ روپے

ملنے کا پتہ

(۱) ادارہ طلوع اسلام ۲۵-بی گلبرگ ۲ لاہور

(۲) مکتبہ دین ودانش۔ چوک اردو بازار لاہور

داغوں کی بہار (مسلسل)

★ عید کا دن جو پہلے ہمیشہ ہزاروں خوشیاں اپنے اندر سمیٹ کر لاتا تھا، ہمارے مرحوم بھائی شوکت پرویز کے گذر جانے سے گویا ساری خوشیاں ہی ختم ہوگئیں پھر بابا جی جیسی شفیق ہستی نے اس زخم پر مرہم رکھا (گو کہ ان کا اپنا زخم ہرا رہا) جب بابا جی کا زخم آیا تو زخم پہ زخم کھانے سے اس کی تکلیف برداشت نہ ہوئی۔ جوں جوں عید نزدیک آرہی تھی اداسیاں چاروں طرف سے گھیر رہی تھیں۔ اس اداسی سے میرا بخار بھی تیز تر ہو رہا تھا۔ ہفتہ بھر میں بخار میں تڑپتی رہی اور رات خواب میں روزانہ آپ اپنا شفقت بھرا ہاتھ میرے سر پر پھیرتے تو مجھے سکون آجاتا وہ بھی کیا دن تھے جب عید کا چاند دیکھنے کے لئے ہم سب بہن بھائی چھت پر چڑھ جاتے اور ہر ایک کی یہی کوشش ہوتی کہ پہلے اسے چاند نظر آئے تاکہ سب سے پہلے وہ بابا جی کے سینے سے لگ جائے۔ جیسے ہی چاند نظر آتا ایک شور مچ جاتا وہ دیکھو چاند نظر آگیا اور ہم سب عید مبارک کا شور مچاتے ہوئے بابا جی کے کمرے کی طرف لپکتے۔ سب باری باری بابا جی سے گلے ملتے اور دعاؤں سے جھولیاں بھر لیتے۔

دوسرے دن بابا جی کو سب کا انتظار رہتا کہ سب بیٹیاں اپنے اپنے گھروں سے جلدی جلدی آجائیں اور بچوں کی رونق سجے۔ جیسے ہی دیر ہو جاتی بابا جی بار بار اس کے گھر پیغام بھیجتے کہ جلدی سے بچوں کو لے کر آجاؤ۔ پھر ہم بابا جی سے گلے ملتے اور ایسا سکون ملتا گویا عید کی خوشی پوری ہو جاتی۔

پیارے بابا جی! اس مرتبہ بھی میں اکیلی اپنی چھت پر کھڑی کتنی دیر تک اس چاند کو ڈھونڈتی رہی لیکن وہ مجھے نظر نہ آیا آخر آنسوؤں کی قطار نے مجھے ہوش دلایا کہ وہ چاند جسے تو ڈھونڈ رہی ہے نہ جانے کہاں ڈوب گیا ہے؟

صبح ہوئی آپ سے ملنے کو اس قدر دل بے چین ہوا کہ کچھ سمجھ نہ آئی تو قبرستان چلی گئی۔ بابا جی تینوں بچوں نے اپنے ننھے منھے ہاتھوں سے آپ کو پھولوں کی خوشبو پیش کرنے کی جرأت کی۔ میں دعا گو تھی کہ سب سے چھوٹی بیٹی جسے آپ پیار سے پارو کہتے تھے اس نے مجھے چونکا دیا۔ وہ بے حد مضطرب ہو کر

ہچکیاں لیتے ہوئے بول رہی تھی۔ "ہمارے بابا جی تو اتنے اچھے تھے وہ کیوں چلے گئے وہ ہمیں اتنا پیار کرتے تھے۔ وہ بھی مر گئے" اس کی توتلی زبان سے جب میں نے یہ الفاظ سنے تو مجھ سے برداشت نہ ہوسکا۔ مجھے یوں لگا کہ اس کی زبان سے یہ سن کر آپ بھی کانپ گئے ہیں۔

بابا جی آپ کی شفقت سے محرومی بہت بڑا خلاء ہے جو کبھی پورا نہ ہوسکے گا۔ کیونکہ ہمارے گھر کا ہر چھوٹا بڑا آپکی شفقت کا محتاج تھا۔ مجھے یہ شرف حاصل رہا کہ بابا جی روزانہ شام کو میرے گھر قدم رنجہ فرماتے ایک دن میں نے کہا کہ بابا جی موسم تو بہت اچھا ہے پتہ نہیں پھر اداسی کیوں لگ رہی ہے؟ آپ نے مسکرا کر کہا۔

...... دل کیا اداس ہے گویا زمانہ اداس ہے۔ یہ بات بالکل درست تھی زمانہ آج بھی عید کی خوشیاں سمیٹ رہا ہے۔ لیکن ہمارے لئے چاروں طرف اداسی ہے لیکن مایوسی نہیں۔ کیونکہ آپ کی آواز بار بار کانوں سے ٹکراتی ہے کہ "مایوس نہ ہونا اور ہر حال میں خدا کا شکر ادا کرتی رہنا" بابا جی ہم آپ کے دیئے ہوئے سبق اور علم کے خزانے سے ہمیشہ فیض یاب ہوتے رہیں گے اور خدا سے دعا ہے کہ ہماری اگلی نسلیں بھی یونہی کریں۔

(سلمیٰ پرویز)

★ مفکر قرآن علامہ چوہدری غلام احمد پرویز صاحب ہم سے جدا ہوگئے۔ موجودہ دور میں ان کی جس قدر ضرورت تھی اس کا ملت اسلامیہ کو پوری طرح احساس ہے۔ وہ سچے عاشق رسول تھے۔ ان کو پیغمبر اسلام سے بے پناہ محبت اور عقیدت تھی۔ جب بھی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا نام ان کی زبان پر آتا تو شدت جذبات سے ان کی آواز بھرا آتی اور آنکھیں نم آلود ہو جاتیں۔ خدائے تعالیٰ جناب پرویز صاحب کو غریق رحمت فرمائے اور ہماری راہ گم کردہ قوم کو ان کی تصانیف سے استفادہ کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

(حافظ محمد یعقوب خان تابیک ضلع سرگودھا)

★ بہر حال مرحوم کی وفات پر جو صدمہ ہوا اور جو قیامت ٹوٹ پڑی وہ بیان کرنے سے قاصر ہوں۔ اگرچہ وہ چراغ بجھ گیا۔ لیکن ساتھ ہزاروں قندیلوں اور چراغوں کو روشن اور منور کرگیا۔ جوکہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے تابندہ ستاروں اور سورج کی طرح جگمگاتے رہیں گے اور گم کردہ راہ لوگوں کو راستہ دکھاتے رہیں گے۔

(غلام محمد مردان)

★ حضرت علامہ غلام احمد پرویز گو طبعی طور پر ہم سے جدا ہوگئے ہیں۔ لیکن انہوں نے صحیح قرآنی مفکر کی جو شمع روشن رکھی وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے مذہب کی بے روح د

دے مقصد رسومات و عقائد کی گھٹا ٹوپ تاریکیوں کو دور کر کے دین کی اعلیٰ و ارفع اقدار و محاسن کی دنیا میں منور کرتی رہے گی۔ (شیخ محمد بشیر ایڈووکیٹ تلہ گنگ)

★ پرویز صاحب کے نکری ارتقا نے جس انقلاب آفریں دینی ادب کو قرآن کی روشنی میں ہم سب تک پہنچایا ہے۔ وہ صدیوں تک حق اور باطل کے درمیان دیوار چین بنا رہے گا۔
بابا جی کا شاگرد
(اقبال نادک لاہور)

★ بابا جیؒ نے ایک دنیا پر یہ واضح کیا کہ ہماری مشکلات کا واحد حل قرآن مجید کے احکام کی عملی پیروی میں ہے۔ بابا جی ایک دور کے نمائندہ واحد شخصیت تھے۔ وہ رہتی دنیا تک یاد کئے جائیں گے۔ اور کروڑوں لوگ اُن ان کا رستے فیضیاب ہونگے
(ڈاکٹر بشیر الحق پشاور)

★ ۲۴ فروری ۱۹۸۵ء کی شام کو اس صدی کی نابغۂ روزگار شخصیت۔ مفکرِ قرآن اور عظیم محب وطن محترم جناب غلام احمد پرویز صاحب ہم سے طبعی طور پر ہمیشہ ہمیشہ کیلئے رخصت ہو گئے لیکن ان کی روشن ہوئی مشعلِ قرآنی ہمارے ذہنوں کو ہمیشہ منور کرتی رہے گی۔
(محمد الیاس۔ جڑانوالہ)

★ علامہ غلام احمد پرویز کی وفاتِ حسرت آیات پر دلی صدمہ ہوا۔ قرآنی تعلیمات کی نشرو اشاعت ان کی زندگی کا مقصدِ وحید تھا۔ اسلامی طرزِ فکر میں ان کی تصانیف کا درجہ بہت وقیع اور بلند ہے۔ ایسے نابغۃ الدہر انسان صدیوں کے بعد پیدا ہوتے ہیں۔
(فیروز دین بزمِ طلوعِ اسلام شکر گڑھ ضلع سیالکوٹ)

★ ہمارے بابا جی ہی اس دور کی عظیم ہستی تھے۔ جنہوں نے سرمایہ داروں۔ وڈیروں و مذہبی پیشواؤں کی سخت مخالفت کے باوجود اپنے مشن میں کامیابی و کامرانی حاصل کی۔ گو وہ آنکھوں سے اوجھل ہو گئے ہیں۔ لیکن ان کا قیمتی علمی سرمایہ ہماری ہر وقت رہنمائی کر گیا۔
(محمد مختار۔ کراچی)

★ کچھ سخنور تھے سحر اپنا دکھا کر چل دیئے
کچھ مسیحا تھے کہ مردوں کو جلا کر چل دیئے
(محمد الیاس ناظم بھکر)

★ محترم جناب پرویز صاحب کی وفات پر میں بھی آپ کے غم میں برابر کا شریک ہوں۔ جو کمی ان کے جانے سے واقع ہوئی ہے ہمیں انکے نکری مقاصد کو خلوص نیت سے تکمیل تک پہنچا کر اسے پورا کرنے کی اپنی سی سعی ضرور جاری رکھنی ہے۔
(عباس نکوی۔ راولپنڈی)

★ میرے محسن بھائی جناب غلام احمد پرویز صاحب اس جہاں سے رخصت ہو گئے۔ اللہ پاک مرحوم مغفور کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا کرے اور مرحوم و مغفور کے لواحقین کو اللہ پاک صبر کی توفیق عطا کرے۔

(فاطمہ گیلی بندر)

★ پھر وہ وقت بھی یاد آتا ہے جب کبھی کبھار پرویز صاحب درس میں یہ شعر پڑھتے تھے تو دل ڈوب جاتا تھا:

ے محبت کرنے والے کم نہ ہوں گے تیری محفل میں لیکن ہم نہ ہوں گے

آج وہ ملت اسلامیہ کی عزت و عظمت کا عظیم پیکر واقعی ہم میں موجود نہیں ہے۔ لیکن ان کا بحر افکار آنے والی ہزاروں نسلوں کے لئے باعث سیرابی ہوگا۔ اور اسی تصدق خدا تعالیٰ کی رحمتیں ان پر نازل ہوتی رہیں گی۔

(ڈاکٹر محمد اسلم بھٹہ ملتان)

★ میرے پاس غموں اور آنسوؤں کے سوا اور ہے کیا۔ کہ پرویز صاحب کی وفات پر لکھوں۔ بس یہ کہوں گا کہ نہ صرف میں بلکہ عالم اسلام ایک عظیم ہستی سے محروم ہوا مگر

ے سدا روشن رہیں یہ چراغ جو دل و جاں سے ماہتاب کئے تو نے
لہلہاتے رہیں یہ کھیت جو خونِ جگر سے سیراب کئے تو نے

(محمد طاہر۔ نواں کلی۔ صوابی۔ مردان)

★ آہ! بابا جی اک حسین و سعید روح! خزینۂ علم و حکمت فرقانی! تو نے اپنے فکر قرآنی سے ملت کو حیات نو اور ملکوتی حسن و جمال بخشا۔ زندگی کی ندی کو تلاطم اور روانی عطا کی۔ فکر و سوز کی حرارت سے سینوں کو شعلہ صفت بنا دیا! تیری بولتی تحریروں نے ہم گونگوں کو بولنا سکھا دیا۔ ہمیں زندگی کا شعور احساس بخشا۔ قرآنی انقلاب کی جوت جگا دی۔

(حفیظ فاروقی حجازی سرگودھا)

★ پرویز صاحب کی وفات پرُملال پر ہمیں بے حد غم ہے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ ہمیں ان کے فرمودات پر استقامت سے عمل کرنے کی ہمت دے۔

(محمد دین۔ محمد اسلم۔ ارشد جمیل، محمد اکرم و رفقاء، موضع گوبند پور۔ سیالکوٹ)

★ پرویز صاحب کو تو حیات جاوداں مل گئی۔ کتنوں کی نفسیاتی کشمکش کو دُور کر گئے لیکن کتنے ہی اب محروم ہو جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ عالمِ امر میں کیا تدبیریں کر رہا ہے یہ تو ہم نہیں جان سکتے لیکن اتنا تو مجھے محسوس ہوتا ہے کہ عالم خلق میں اس خلا کو پُر کرنا ناممکن نہیں تو مشکل ترین مرحلہ نظر آتا ہے۔

(منصور عالم کینیڈا)

حقائق و عبر

قرآن اور شیعہ مذہب

حال ہی میں ایک شیعہ عالم دین علامہ سید حامد علی موسوی صاحب کے فرزند علامہ عرفان حیدری صاحب نے شیعہ مذہب ترک کرکے، اہل سنت کے مذہب کو اختیار کرنے کا اعلان کیا ہے آپ کا انٹرویو مختلف دینی رسالوں میں چھپا ہے۔ رسالہ البلاغ کراچی کی جون ۱۹۸۵ء کی اشاعت میں آپ کا جو انٹرویو چھپا ہے اس میں سے ایک سوال اور جواب جس کا قرآن مجید سے تعلق ہے، طلوع اسلام کے قارئین کی خدمت میں پیش کیا جاتا ہے۔

س: آپ کن وجوہات کی بناء پر شیعہ مذہب کو ترک کرنے پر مجبور ہوئے؟

ج: شیعہ مسلک کا مبلغ ہونے کے باوجود مجھے شرح صدر حاصل نہیں تھا۔ اس لئے میں علماء اہلسنت کی کتب کا مطالعہ بھی کرتا تھا۔ علماء دیوبند میں سے بعض بزرگوں کی کتابوں سے بہت متاثر ہوا۔ اور چند اہم وجوہات جن کی وجہ سے میں اس مذہب کو باطل یقین کرتے ہوئے تائب ہونے پر مجبور ہوا یہ ہیں:-

۱۔ ۲۱ رمضان المبارک کو شیعہ حضرات حضرت علیؓ کا جنازہ نکالتے ہیں۔ گذشتہ رمضان میں جب یہ رسم ادا ہو رہی تھی تو حسب سابق مبلغین و ذاکرین کی ایک کثیر تعداد موجود تھی تو اس وقت سب نے اصحاب رسولؐ پر تبرّیٰ کرنا شروع کر دیا۔ میں نے کہا کہ جس قدر میں نے تحقیق کی ہے ہمارے کسی امام نے ان حضرات پر لعنت نہیں بھیجی۔ تو اس وقت میرے والد صاحب سید حامد علی موسوی جو آج کل رافضیوں کے ایک گروپ کے قائد ہیں، فرمانے لگے کہ آپ کو معلوم ہونا چاہیئے تولّیٰ اور تبرّیٰ ہمارے مذہب کا ایک اہم جزو اور حصہ ہیں۔ تو اس پر میں نے والد صاحب کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے حضرت ابوبکر صدیقؓ پر سب کیا۔ لیکن جب حضرت عمرؓ پر تبرّیٰ شروع کیا تو میری زبان بند ہو گئی، اور کافی دیر تک میری قوت گویائی سلب رہی۔ میں اللہ تعالیٰ کو گواہ بنا کر کہتا ہوں کہ میرے توبہ کرنے پر اور خدا سے معافی مانگنے پر میری زبان نے دوبارہ چلنا شروع کیا تو میرا یقین کامل ہوا کہ اصحاب رسول سچے ہیں اور یہ ابن سبا یہودی کی نسل اپنے اس ملعون عمل سے اہل بیت کو بھی بدنام کر رہی ہے۔

۲۔ شیعہ حضرات ام المؤمنین حضرت عائشہؓ حضرت حفصہؓ پر لعنت بھیجتے ہیں۔ میں نے سوچا کہ معاذ اللہ اگر یہ عورتیں اتنے برے کردار کی مالک تھیں تو خدا نے اپنے پیغمبرؐ کو ان

سے شادی کرنے سے کیوں نہ روکا۔ تحقیق سے میں اس نتیجے پر پہنچا کہ یہ ایک یہودیانہ سازش کا نتیجہ ہے۔ اہل تشیع قرآن مجید کو تحریف شدہ تصور کرتے ہیں اور یہی عقیدہ رکھتے ہیں۔

(بحوالہ ماہنامہ البلاغ کراچی بابت جون صفحہ ۴)

۲۔ غیر سودی معیشت

ملک عزیز میں غیر سودی نظام معیشت نافذ کرنے کے لئے علمائے کرام نے حکومت پاکستان سے یہ مطالبہ کیا ہے:

قومی بچت کے نام پر جس طرح سودی اسکیموں کو فروغ دیا جا رہا ہے اس کو قابل تعزیر جرم قرار دیا جائے اور ان اسکیموں کو قومی سطح پر مشتہر کرنے اور بچت کا رہ کے ہفتے منانے کی بجائے جو کہ خود سودی نظام کو تقویت و دوام بخشتے ہیں، ہر وسیلے کو بروئے کار لا کر اسلام کے بلاسودی اقتصادی نظام کو رائج اور مستحکم کیا جائے کہ یہ حالات کا ناگزیر تقاضا ہے۔ کیونکہ افلاس و استیصال کا خاتمہ سود کے خاتمے کے بغیر ممکن نہیں ہے۔"

علاوہ ازیں یہ بات قابل صد افسوس ہے کہ زکواۃ جیسے پاک مال کو سود ریٹ سے منہا کر کے نہ صرف نظام زکواۃ کی برکات سے قوم کو محروم کر دیا گیا ہے بلکہ الٹا سودی نظام کو اسلامی رنگ دے کر دوام و استحکام بخشا گیا ہے۔ اسی طرح شیعہ حضرات کو زکواۃ و عشر سے مستثنیٰ قرار دے کر ضعیف الایمان سُنّی مسلمانوں کو عملاً شیعہ بننے کی ترغیب دی جا رہی ہے۔ اسلامی ریاست کے لئے یہ انتہائی ضروری ہے کہ کسی کلمہ گو کو زکواۃ و عشر سے مستثنیٰ قرار نہ دے ورنہ اندیشہ ہے کہ آئندہ چند سالوں میں مالی منفعت کے تحت ملک کی ایک کثیر تعداد شیعہ مذہب اختیار کر لے گی۔

سودی نظام معیشت کھلے طور پر اللہ اور اس کے رسولؐ کے خلاف اعلان جنگ ہے۔ سب سے پہلے اس جنگ کو بند کرنا ہوگا کہ اس سود نے پوری قوم کو گرانی کے عذاب میں مبتلا کر رکھا ہے۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے: "جب کسی قوم میں زناکاری اور سود خوری عام ہو جاتی ہے تو ان پر اللہ کے غضب کا نزول جائز ہو جاتا ہے۔"

(بحوالہ البلاغ کراچی بابت ماہ جون ۱۹۸۵ء صفحہ ۴۹، ۵۰)

ماہنامہ البلاغ جس سے یہ اقتباس نقل کیا گیا ہے، پاکستان میں دیوبندی مکتب فکر کا ترجمان ہے۔ حیرت کی بات ہے کہ ان حضرات کی اس تحقیق کے باوجود کہ زکوٰۃ سود کے ریٹ سے منہا کی جا رہی ہے بہت سے دیوبندی حضرات نہ صرف یہ کہ اسے جائز و حلال سمجھتے ہیں۔ بلکہ اسے حکومت سے حاصل کرنے کے لئے طرح طرح کے جائز و ناجائز طریقے اختیار کرتے ہیں۔

۳۔ علامہ اقبالؒ اور زمینداری نظام

قرآن اکیڈمی کے بانی محترم جناب ڈاکٹر اسرار احمد صاحب اپنے ماہنامہ حکمت قرآن کی جون ۱۹۸۵ء کی اشاعت کے صفحات ۴۳ تا ۴۵ پر زمینداری نظام کے بارے میں علامہ اقبالؒ کے خیالات

کو ان الفاظ میں پیش کرتے ہیں۔

میری نظر سے جب پہلی بار یہ اشعار گزرے تو یقین کیجئے میں کانپ گیا تھا ؎

خدا آں ملتے را سروری داد　　کہ تقدیرش بدست خویش بنوشت

بآں قومے سروکارے ندارد　　کہ دہقانش برائے دیگراں کشت

ذرا دوسرے شعر پر اپنی توجہات مرتکز کیجئے۔ جس قوم کا دہقان دوسروں کے لئے کاشت کر رہا ہو، اللہ کا اس سے کوئی سروکار نہیں۔

یہ ہے پیام اقبالؒ۔ یہ دو سود ہیں جو ہم پر مسلط ہیں۔ ایک نقد کا سود ہے۔ دوسرا زمین کا سود ہے۔ جب تک یہ دونوں سود ختم نہیں ہوں گے اور ان کی جڑیں نہیں کٹیں گی سرمایہ داری حقیقی اسلام کی راہ میں سنگ گراں بنی رہے گی۔ حرام ذرائع میں ام الخبائث ہے سود! ہمارا سارا اقتصادی نظام چاہے وہ کاشت کاری کا ہو اور آمد برآمد کا ہو، صنعت وتجارت کا ہو، بنک کاری کا ہو، وہ سب کا سب سود پر چل رہا ہے۔ علامہ اقبالؒ نے اس سود کے بارے میں کیا خوب کہا ہے ؎

از ربا آخر چہ مے زاید فتن　　کس نداند لذت قرض حسن

اس ربا (سود) کے باطن سے تو صرف فتنے ہی برآمد ہو سکتے ہیں۔ اس کے سوا اور کچھ نہیں۔ قرض حسن کی لذت سے (افسوس) کہ کوئی واقف نہیں۔ (علامہ نے سود کے مقابلے میں قرض حسن کو متعارف کرایا ہے)

از ربا جاں تیرہ دل چوں خشت و سنگ　　آدمی درندہ بے دندان و چنگ

اس سود کی وجہ سے روح میں تاریکی آجاتی ہے اور دل پتھر کی طرح سخت ہو جاتا ہے انسان کے اگرچہ چیر پھاڑ والے دانت اور پنجے نہیں ہوتے لیکن سود خواری کی وجہ سے آدمی درندہ صفت بن جاتا ہے۔

جب تک یہ سودی نظام بالکلیہ ختم نہیں ہوتا اس کو بیخ و بن سے اکھاڑا نہیں جائے گا۔ پاکستان میں حقیقی نظام اسلامی کا نفاذ امید موہوم ہے۔ یہ اللہ کا فضل ہے کہ ہمارے یہاں ایسے لوگ موجود ہیں، جن میں یہ ہمت ہے کہ غلط بات کو دلائل کے ساتھ غلط کہیں۔ علمائے کرام کے حلقے میں بھی ایسے بزرگ بحمداللہ موجود ہیں جو خیر خواہی اور نصح کے جذبے کے ساتھ غلط اقدامات کی طرف توجہ دلا رہے ہیں۔ پھر ہمارے یہاں دینی مزاج رکھنے والے جو اعلیٰ ماہرین اقتصادیات ہیں، ان کی آراء سامنے آچکی ہیں کہ موجودہ بنکاری کے نظام میں سرسری اور معمولی تغیر و تبدل سے اگر یہ سمجھا جائے کہ سودی نظام بالکل ختم ہو گیا یا قریب الختم ہے تو یہ بہت بڑا مغالطہ ہے

رہا زمینداری کا معاملہ تو اس طرف تو ابھی کوئی توجہ ہے ہی نہیں۔ علامہ اقبالؒ کے محبان

کی بھی علامہ کی "انقلاب" والی نظم پر شاید ہی توجہ مرکوز ہوئی ہو جو "زبورِ عجم" میں شامل ہے اس نظم کا پہلا بند یہ ہے ؎

خواجہ از خونِ رگِ مزدور سازد لعلِ ناب
از جفائے دہ خدایاں کشتِ دہقاناں خراب
انقلاب۔ انقلاب! اے انقلاب!

ایک بند کے اندر علامہ اقبالؒ نے دونوں سود جمع کر دیئے ہیں۔ جب تک ان کی جڑ نہیں کٹے گی نظام میں کوئی بنیادی تبدیلی نہیں آئے گی۔

قارئین طلوع اسلام جانتے ہیں کہ علامہ پرویز صاحب قیام پاکستان کے وقت سے ہی معاشرے کی اس خرابی کی طرف قوم کی توجہ دلاتے رہے ہیں، ان کا ایک مبسوط مضمون جو آج سے پورے تنتیس سال پہلے طلوع اسلام میں چھپا تھا۔ اسے جولائی ۱۹۸۵ء کی اشاعت میں دوبارہ قارئین کی خدمت میں پیش کیا جا چکا ہے۔ خوشی کی بات ہے کہ اتنی مدت گزر جانے کے بعد ہمارے علماء حضرات کو بھی اس برائی کا احساس ہوا ہے کہ اس خرابی کے خاتمے کے بغیر ملک عزیز میں اسلامی نظام نافذ نہیں ہو سکتا۔

جس معاملے کو ہمارے علماء حضرات آج سود قرار دے رہے ہیں کاش وہ اسے قیام پاکستان کے وقت سے ہی ایسا سمجھ کر اسے ختم کرنے کی کوشش کرتے تو آج ہمارا ملک اسلامی نظام کی برکتوں سے مالا مال ہوتا۔

(صفحہ ۴۰ سے آگے) **بقیہ داغ مفارقت**

علامہ اقبال نے ہی آپ کو قرآن مجید کی تفسیر لکھنے کی ترغیب دی تھی۔ اس سلسلے کی کچھ کڑیوں یعنی مفہوم القرآن، لغات القرآن اور تبویب القرآن کی تو انہوں نے تکمیل کر لی تھی۔ اور اب قرآن کی تفسیر "مطالب الفرقان" کی تکمیل میں مشغول تھے کہ موت کے ٹھنڈے ہاتھوں نے انہیں ہم سے چھین لیا۔ موت کے وقت تک وہ اس تفسیر کی چھ جلدیں مکمل کر سکے تھے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن

عمر ہا در کعبہ و بُت خانہ می نالد حیات
تا ز بزمِ عشق یک دانائے راز آید بروں

ہائے افسوس ہم اپنے وقت کے محرمِ راز کی رفاقت سے محروم ہو گئے!

دگر دانائے راز آید کہ ناید!

قرآن مجید کے ایک نئے اُردو ترجمے کی ضرورت

میرے بعض احباب نے ان دنوں خواہش ظاہر کی کہ میں اپنے سیدھے سادھے انداز میں (جو ان حضرات کو پسند ہے) قرآن پاک کا ترجمہ کروں چنانچہ میں نے منگل ۱۰ ستمبر ۱۹۸۰ء مطابق ۲ ذی الحجہ ۱۴۰۰ھ کو اللہ پر بھروسہ کر کے قرآن کا ترجمہ کرنا شروع کر دیا۔ پندرہ دن کی کوشش کے بعد الم کا ترجمہ مکمل ہو گیا۔ اگر یہ رفتار جاری رہی تو انشاء اللہ ڈیڑھ سال میں پورے قرآن کا ترجمہ مکمل ہو جائے گا۔ اس کے بعد اللہ نے توفیق بخشی تو ترجمہ پر دوبارہ غور کیا جائے گا۔ اس لئے کہ یہ بڑی ذمہ داری کا کام ہے معمولی سی غلطی بہت بڑا قومی اور ملی نقصان پہونچا سکتی ہے۔ اس کے بعد بھی اگر غلطی رہ جائے تو وہ قابل عفو ہے میرا عقیدہ ہے کہ جو کام نیک نیتی سے انسان کی بھلائی کے لئے کیا جاتا ہے۔ اگر اس میں کوئی غلطی رہ بھی جاتی ہے (اور کہاں غلطی نہیں رہتی؟) تو اللہ تعالیٰ اس غلطی سے درگذر فرماتا ہے۔ اور اس کے انعام میں کسی طرح کی کمی نہیں ہوتی اس لئے کہ اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ (بخاری) اعمال کی جزا و سزا کا انحصار نیت پر موقوف ہے"

اس سلسلہ میں ایک بے حد اہم سوال پیدا ہوتا ہے۔

"اردو زبان میں قرآن کے پچاسوں ترجمے موجود ہیں۔ ان کی موجودگی میں ایک نئے ترجمے کی کیا ضرورت ہے۔ مجھے کیا حق ہے کہ میں قوم کا روپیہ اور اپنا وقت ایک ایسے کام پر صرف کروں جو پہلے ہی سے کیا جا چکا ہے اور اب جس کی بظاہر کوئی ضرورت نہیں؟

اس سوال کا تفصیلی جواب تو خود قرآن کے ترجمے سے ملے گا میں سر دست اجمالی جواب پیش کر رہا ہوں۔

مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کے ترجمان القرآن کے علاوہ اب تک میری نظر سے جتنے ترجمے گزرے ہیں ان میں بعض آیات کے ترجمے میں یا ان کی تشریح میں تنگ نظری اور تعصب کا رنگ نمایاں ہے یا پھر علمائے سلف کی تقلید میں آیات کے واضح مفہوم کو بدل کر قدامت پرستی کا ثبوت دیا گیا ہے اور پرانے مفسرین اور مترجمین کے نظریات کو سامنے رکھ کر شعوری یا غیر شعوری طور پر بعض آیات کے واضح مفہوم سے انحراف کیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر چند آیات کے ترجمے اور مفہوم کو پیش کر رہا ہوں۔

۱۔ قرآن میں بارہا اس قانون کا اعلان کیا گیا ہے کہ " ایک انسان کے عمل کا ثواب دوسرے کو نہیں مل سکتا۔" ـــــ عہد حاضرہ کے مشہور ترین مترجم مولانا ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم و مغفور نے سورۂ نجم کی آیات ۳۸ - ۳۹ کا ترجمہ اس طرح کیا ہے " کہ کوئی بوجھ اٹھانے والا دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا اور یہ کہ انسان کے لئے کچھ نہیں ہے۔ مگر وہ جس کی اس نے سعی کی ہے " ان آیات کی تشریح کرتے ہوئے مولانا مرحوم فرماتے ہیں " اس ارشاد سے تین اصول نکلتے ہیں (۱) ایک یہ کہ ہر شخص جو کچھ پائے گا اپنے عمل کا پھل پائے گا۔ (۲) دوسرے یہ کہ ایک شخص کے عمل کا پھل دوسرا نہیں پا سکتا الّا یہ کہ اس عمل میں اس کا اپنا کوئی حصہ ہو۔ تیسرے یہ کہ کوئی شخص سعی اور عمل کے بغیر کچھ نہیں پا سکتا " (تفہیم القرآن جلد ۵ صفحہ ۲۱۵)

مولانا مرحوم تسلیم کرتے ہیں کہ " ایک شخص کے عمل کا پھل دوسرا نہیں پا سکتا " بالفاظ دیگر کوئی شخص اپنے عمل کا پھل (ثواب) دوسرے کو نہیں دے سکتا۔ لیکن اکثر مفسرین کی طرح وہ خود بھی اس " قانون الٰہی " کو عالمانہ بے باکی کے ساتھ توڑتے ہیں۔ ملاحظہ ہو " حنفیہ " کا مسلک یہ ہے کہ انسان اپنے ہر نیک عمل کا ثواب دوسرے کو ہبہ کر سکتا ہے۔ خواہ وہ نماز ہو یا تلاوت قرآن یا صدقہ یا حج و عمرہ۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ آدمی جس طرح مزدوری کر کے مالک سے یہ کہہ سکتا ہے کہ اس کی اجرت میرے بجائے فلاں شخص کو دے دی جائے اسی طرح وہ کوئی نیک عمل کر کے اللہ تعالیٰ سے یہ دعا بھی کر سکتا ہے کہ اس کا اجر میری طرف سے فلاں شخص کو عطا کر دیا جائے۔" (تفہیم القرآن جلد ۵ ص۲۱۶)

مولانا مرحوم فرماتے ہیں " انسان اپنے ہر نیک عمل کا ثواب دوسرے کو ہبہ کر سکتا ہے " اب کس کی بات مانی جائے؟ خدا کی یا علمائے کرام کی؟ پھر اگر ایک کا ثواب دوسرے کو دیا جا سکتا ہے تو امتحان کی حیثیت ہی کیا رہ جائے گی۔ اور قیامت کے دن اعمال کیوں تولے جائیں؟ دیا ہوا ثواب کس کے پلڑے پہ تولا جائے گا؟ یہ تو ایسا ہوا جیسے ایک لڑکے کا نمبر دوسرے لڑکے کو دے دیا اور اس طرح ہر لڑکا جو فیل ہو رہا ہے دوسرے لڑکے کا نمبر لے کر پاس ہو سکتا ہے اور ہر قاتل فاسق ڈاکو دوسرے کا ثواب لے کر جنت کا حقدار بن سکتا ہے۔ اور خدا کا قانون کہ ذرہ ذرہ عمل کا حساب ہوگا بے کار جائے گا اور " میزان عمل " ایک لفظ مہمل ہو کر رہ جائے گا۔

اس طرح کی تحریف اکثر ترجموں اور تفسیروں میں کی گئی ہے۔

(۲) قرآن کی چند آیات میں حضرت عیسیٰ کی طبعی موت کا ذکر واضح الفاظ میں موجود ہے۔ مثلاً سورۂ آلِ عمران کی آیت نمبر ۵۵ میں فرمایا " اے عیسیٰ! میں تجھے وفات دینے والا ہوں اور اپنی طرف اٹھانے والا ہوں اور جن لوگوں نے کفر کی راہ اختیار کر رکھی ہے۔ (انکی صحبت) سے تجھے پاک کرنے والا ہوں "۔

اس آیت کا سیدھا سادا مطلب یہ ہے کہ خدا نے عیسیٰؑ کو ان کی وفات کے بعد اپنی طرف اٹھا لیا۔ یعنی ان کی وفات کے بعد ان کو اعلیٰ مرتبہ پر فائز کیا۔ حضرت ادریس کی وفات کے متعلق بھی اسی طرح کا ایک جملہ فرمایا۔

"اور (اے پیغمبر!) کتاب (یعنی قرآن) میں ادریس کا ذکر کر ــــ وہ سچا نبی تھا۔ ہم نے اس کو اونچی جگہ اٹھا لیا۔"

(یعنی وفات کے بعد اس کو اعلیٰ مرتبہ پر فائز کیا)۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ حضرت ادریس کو مرنے سے پہلے آسمان پر پہنچا دیا۔

لیکن بعض موضوع احادیث کی بنا پر ہمارے مفسروں نے فرض کر لیا کہ حضرت عیسیٰ آسمان پر زندہ اٹھا لئے گئے۔ اور تمام انسانوں سے الگ تھلگ۔ اکیلے چوتھے آسمان پر زندگی کے دن گذار رہے ہیں۔ یہ تنہائی قرب قیامت تک باقی رہے گی۔ اور جانے کس مصیبت سے ہزاروں یا لاکھوں سال کی زندگی کٹے گی۔ پھر قیامت سے پہلے آسمان سے اسی دنیاوی جسم کے ساتھ اتریں گے اور پیغمبری کے اعلیٰ ترین عہدے سے گر کر رسول اللہؐ کے ایک امتی کی حیثیت سے ساری دنیا کے لوگوں کو اور خود اپنی امت کو مسلمان بنائیں گے۔ آخر یہ کس جرم پر پیغمبری کے عہدے سے معزول کئے جائیں گے۔

حیرت ہے کہ ایسے تجربات کو ثابت کرنے کے لئے قرآن کی آیات کے معنی بدلنے کی کوشش میں چھوٹے بڑے سب شامل ہیں۔ سورۂ آل عمران کی آیت نمبر ۵۵ جس کا حوالہ اوپر دیا جا چکا ہے اس کا ہمارے "مترجمین" نے جو ترجمہ کیا ہے۔ ذیل میں درج کیا جاتا ہے!

(الف) مولانا اشرف علی مرحوم (مغفور) کا ترجمہ ملاحظہ ہو "جب اللہ تعالیٰ نے فرمایا" اے عیسیٰ (کچھ غم نہ کرو) بے شک میں تم کو وفات دینے والا ہوں (فی الحال) میں تم کو اپنی طرف اٹھائے لیتا ہوں اور تم کو ان لوگوں سے پاک کرنے والا ہوں جو منکر ہیں" مولانا مرحوم نے توسین میں (فی الحال) "بڑھا کر آیت کے مفہوم کو بالکل الٹ دیا۔

خدا فرماتا ہے "میں تجھے وفات دینے والا ہوں۔ اور اپنی طرف اٹھانے والا ہوں"۔ مولانا مرحوم اس کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"یعنی اپنے وقت موعود پر (قیامت سے پہلے) طبعی موت سے وفات دینے والا ہوں۔ اس سے مقصود بشارت دینا تھا حفاظت من الاعداء کی۔ یہ وقت موعود اس وقت آئے گا جب قرب قیامت کے زمانے میں عیسیٰ علیہ السلام آسمان سے زمین پر تشریف لاویں گے جیسا کہ حدیث صحیحہ میں آیا ہے ...... اب زندہ آسمان پر موجود ہیں"۔

(ب) مولوی محمد علی حسن صاحب بہاری کا ترجمہ ملاحظہ ہو (وہ وقت بھی قابل یادگار ہے) جب کہ اللہ تعالیٰ نے (بوقت گرفتاری عیسیٰ کے) فرمایا کہ اے عیسیٰ (تم کچھ غم نہ کرو) ضرور ہم تم کو (اپنے

وقت موعود پر طبعی موت سے) موت دیں گے (الیس "جب یہ بات قرار پا چکی ہے کہ تم اپنی طبعی موت سے مروگے اور یہ موت قریب قیامت کے ہوگی۔ تو پھر جان رکھو کہ دشمن تمہیں سولی نہیں دے سکتے اور تم ان کے ہاتھوں سے محفوظ رہوگے، اور (ہاں فی الحال) ہم تم کو اپنی طرف (آسمان پر) اٹھا لیتے ہیں"۔

ان دونوں حضرات نے "متوفیک" کے معنی نہیں بدلے یعنی "میں وفات دینے والا ہوں" کیا۔ لیکن دوسرے مترجمین نے اس لفظ کے معنی بدل دیئے۔ فتح محمد خاں کا ترجمہ ملاحظہ ہو! "اس وقت خدا نے فرمایا کہ عیسیٰ میں تمہاری دنیا میں رہنے کی مدت پوری کر کے تم کو اپنی طرف اٹھا لوں گا اور تمہیں کافروں (کی صحبت) سے پاک کر دوں گا"۔

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کا ترجمہ ملاحظہ ہو! "جب اس نے کہا کہ "اے عیسیٰ اب میں تمہیں واپس لے لوں گا اور تجھ کو اپنی طرف اٹھا لوں گا۔ اور جنہوں نے تیرا انکار کیا ہے ان سے یعنی ان کی معیت سے اور ان کے گندے ماحول میں ان کے ساتھ رہنے سے) تجھے پاک کر دوں گا"۔

(تفہیم القرآن جلد اول صفحہ ۲۵۷ - ۲۵۸)

مولانا مرحوم فرماتے ہیں۔ توفیٰ کے اصل معنی لینے اور وصول کرنے کے ہیں روح قبض کرنا" اس لفظ کا مجازی استعمال ہے نہ کہ اصل لغوی معنی یہاں یہ لفظ (TO RECALL) کے معنی میں مستعمل ہوا ہے یعنی کسی عہدہ دار کو اس کے منصب سے واپس بلا لینا"۔

(تفہیم القرآن جلد اول صفحہ ۲۵۷)

دیکھا آپ نے قرآن کی آیت کے سیدھے سادھے مضمون کو کس کس طرح سے بدلا گیا ہے؟ آپ کسی عربی لغت کو دیکھ لیجئے آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ "توفیٰ" کے معنی "موت دینا" ہے۔

۳۔ اِنَّا انزلنا التورٰۃ فیھا ھدی ونور (المائدہ آیت نمبر ۴۴) کا ترجمہ ہے۔

"بیشک ہم نے تورات نازل کی "جس میں ہدایت اور روشنی ہے" مولانا ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم کو یہ ترجمہ پسند نہیں آیا اس لئے کہ وہ تسلیم نہیں کر سکتے تھے کہ توریت میں ہدایت اور روشنی ہو چنانچہ انہوں نے ترجمہ بدل دیا۔ ملاحظہ ہو۔" ہم نے تورات نازل کی جس میں ہدایت اور روشنی تھی" "ہے" کو "تھی" سے بدل دیا۔

مولانا اشرف علی مرحوم نے بھی اسی طرح کا ترجمہ کیا ہے "ہم نے توریت نازل فرمائی تھی جس میں ہدایت تھی اور وضوح تھا" مولانا مرحوم یہ بھی نہیں برداشت کر سکے کہ توریت میں "نور" یا روشنی ہو چنانچہ نور کا ترجمہ "وضوح" کیا۔ دنیا جانتی ہے کہ "نور" کا ترجمہ "روشنی" ہے۔ علماء کی تنگ نظری اور تعصب نے "ہے" کو "تھی" اور "تھا" سے بدل دیا۔ کیونکہ اگر نہ بدلتے تو ماننا پڑتا کہ "توریت میں ہدایت اور روشنی ہے" اور یہ بات ان کے عقیدے کے خلاف ہے، خدا کہتا ہے کہ "توریت میں ہدایت اور روشنی ہے"۔ ہمارے علماء کہتے ہیں "پہلے تھی اب نہیں ہے"۔[1]

---

[1] اس آیت سے صحیح مفہوم کے لئے دیکھئے، مفہوم القرآن از پرویز جلد اول صفحہ ۲۵۵

۴۔ سورہ قمر کی دوسری آیت "وان یروا اٰیۃ یعرضوا ویقولوا سحر مستمر" کا سیدھا سادا ترجمہ یہ ہے:

"اور اگر یہ لوگ (یعنی کفار مکہ) کوئی معجزہ دیکھ (بھی) لیں تو منہ پھیر لیں گے اور کہدیں گے یہ تو جادو ہے جو ہوتا آیا ہے"۔ چونکہ اس آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ مکّہ والوں نے چاند کو پھٹتے ہوئے نہیں دیکھا تھا اور اکثر مترجمین چاہتے ہیں کہ اس آیت سے چاند کا پھٹنا ثابت ہو جائے۔ اس لئے اس کے ترجمے میں تبدیلی کی گئی یعنی مستقبل کو (FUTURE TENSE) ماضی میں بدلنے کا اہتمام کیا گیا۔ چنانچہ اکثر مترجمین نے اس آیت کا ترجمہ اس طرح کیا ہے "اگر یہ لوگ (یعنی کفار مکہ) کوئی معجزہ دیکھتے ہیں تو منہ پھیر لیتے ہیں اور کہہ دیتے ہیں یہ تو جادو ہے جو ہوتا آیا ہے"۔ پھر اس کی وضاحت اس طرح کی کہ کفار مکہ نے چاند کو پھٹتے ہوئے دیکھا تو منہ پھیر لیا اور کہدیا کہ یہ تو جادو ہے جو ہوتا آیا ہے" یہ تبدیلی اس لئے کی گئی کہ ثابت کیا جا سکے کہ آنحضرت نے انگلی کے اشارے سے چاند کو پھاڑ دیا تھا۔ حالانکہ قرآن کی بیسیوں آیتوں سے یہ ثابت ہے کہ اللہ نے رسول اللہؐ کو کوئی معجزہ نہیں دیا (تفصیل کیلئے دیکھئے میری کتاب "شق قمر" چاند ابھی نہیں پھٹا)۔

۵۔ ان الذین اٰمنوا والذین ھادوا والنصرٰی والصابئین من اٰمن باللہ والیوم الاٰخر وعمل صالحا فلا خوف علیھم ولا ھم یحزنون (البقرہ ۶۲ - اور البقرہ ۱۱۲) اس آیت کا سیدھا سادا ترجمہ یہ ہے۔

"وہ لوگ جو (نبی عربی پر) ایمان لائے (یعنی مسلمان) اور وہ جو یہودی ہوئے اور عیسائی اور صابی (ان میں سے) جو بھی اللہ پر اور روز آخرت پر ایمان لایا اور اس نے نیک کام کئے اس کے لئے نہ کسی طرح کا خوف ہوگا نہ رنج" تمام مترجمین نے اس آیت کا یہی ترجمہ کیا ہے لیکن ان میں سے زیادہ تر ایسے ہیں جن کا راسخ عقیدہ ہے کہ مسلمانوں کے علاوہ کوئی کیسا ہی موحد ہو اور اس نے کتنی ہی نیکیاں کی ہوں۔ اگر وہ مسلمان نہیں ہے تو اس کی ساری نیکیاں اکارت جائیں گی اور وہ ہمیشہ جہنم میں رہے گا اس مفہوم کی اکثر آیات سے جن میں غیر مسلم اقوام کو بھی نجات کا حق دیا گیا ہے۔ ہمارے علماء کو غیر شعوری طور پر انکار ہے۔ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے ترجمہ میں تو کوئی تبدیلی نہیں کی لیکن تشریح نوٹ میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ کسی غیر مسلم کو خواہ وہ موحد ہو اور نیک کردار ہو نجات نہیں مل سکتی[1] (تفصیل کے لئے دیکھئے میری کتاب کتب و حکمت حصہ دوم۔ نجات کا عالمگیر قانون (صفحہ ۵۲)

(۶) علمائے کرام فرماتے ہیں رسول اللہؐ "مسحور" تھے یعنی آپ پر جادو کیا گیا تھا۔ اور آنحضرت

---

[1] اس آیت کے صحیح مفہوم کے لئے دیکھئے۔ مفہوم القرآن جلد اوّل صفحہ ۲۲

اس کے اثر سے تقریباً سال بھر بیمار رہے (تفہیم القرآن جلد ۶ صفحہ ۵۵۲)

لیکن خدا کہتا ہے "(اے پیغمبر!) جب یہ لوگ تمہاری طرف کان لگاتے ہیں تو جو کچھ ان کا سننا ہوتا ہے ہم اسے اچھی طرح جانتے ہیں۔ اور جب یہ ظالم سرگوشیاں کرتے ہوئے کہتے ہیں" تم جس آدمی کے پیچھے پڑے ہو وہ اس کے سوا کیا ہے کہ "جادو زدہ" ہے تو ہم اس سے بے خبر نہیں (بنی اسرائیل ۴۷-۴۸)

(اے پیغمبر!) غور کرو ان لوگوں نے تمہاری نسبت کیسی کیسی باتیں بنائی ہیں۔ جس کی وجہ سے گمراہی میں پڑ گئے پس اب راہ حق نہیں پا سکتے"۔

گویا جو شخص رسول اللہ کو "مسحور" (یعنی جادو زدہ) کہے وہ راہ حق نہیں پا سکتا اور علماء یہ بانگ دہل آنحضرت کو جادو زدہ کہتے ہیں۔

دوسری آیت ملاحظہ ہو" اور یہ ظالم کہتے ہیں کہ تم تو ایک "جادو زدہ" شخص کی پیروی کرتے ہو۔ (اے پیغمبر!) دیکھو یہ تمہارے بارے میں کس کس طرح کی باتیں کرتے ہو۔ سو یہ گمراہ ہو گئے اب انھیں (جو اللہ کے رسول کو جادو زدہ کہتے ہیں راہ حق مل ہی نہیں سکتی"۔

(الفرقان - ۸-۹) ان دونوں آیتوں میں فرمایا گیا۔

"جو لوگ آنحضرت کو "جادو زدہ" کہتے ہیں وہ گمراہ ہیں انہیں راہ حق مل نہیں سکتی۔ اور ہمارے علماء کہتے ہیں کہ آپ "جادو زدہ تھے" (تفصیل کیلئے دیکھئے (آیاتِ محکمات حصہ دوم صفحہ ۸۸)

مختصر یہ کہ قرآن میں ایسی آیتیں کافی تعداد میں ہیں جن کے ترجمہ یا تفسیر میں حسب ضرورت تبدیلی کی گئی ہے۔ اس لئے ضرورت ہے کہ کم سے کم ایک ترجمہ ایسا ہو جس میں کسی آیت کے ترجمے میں کسی طرح کی تبدیلی نہ کی گئی ہو۔ اور ترجمہ کرنے والے نے خدا سے ڈرتے ہوئے ترجمہ کیا ہو۔

از محترم مولوی محمد صاحب کوچہ فرنگن، رام پور، یو پی۔ (انڈیا)

(نوٹ):۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے طلوعِ اسلام نے کوشش کی تھی تو انہی مولوی صاحبان کی جانب سے اس کی مخالفت کی گئی تھی اور دلیل یہ دی گئی تھی کہ پرانے اردو ترجموں سے بہتر ترجمہ نہیں ہو سکتا۔ خدا کا شکر ہے کہ ہماری محنت ضائع نہیں گئی اور اب مولوی صاحبان خود ایک نئے ترجمے کی ضرورت محسوس کر رہے ہیں۔

(طلوع اسلام)

ہم پیدائشی مسلمان!

اَلْحَمْدُ لِلّٰہ ہم مسلمان ہیں۔ مگر آپ کو کیوں شک ہوا؟ کیا آپ جانتے نہیں کہ ہم تو پرکھوں سے مسلمان چلے آ رہے ہیں ہمارے آباؤ اجداد بفضلِ خدا مسلمان تھے۔ ان کے آباؤ اجداد بھی مسلمان۔ یوں نسلاً بعد نسلاً اور اولاد در اولاد ہوتے ہوئے یہ سلسلہ ہم تک پہنچا۔ اور آج ہم مسلمان ہونے پر نازاں ہیں۔ بھلا ہمارے خالص اور کھرے مسلمان ہونے کو کون چیلنج کر سکتا ہے؟ ہمیں تو یہ اعزاز حاصل ہے کہ ہم پیدائشی مسلمان ہیں۔ ہمیں مسلمان ماں باپ نے جنم دیا۔ ہمارے بہن بھائی مسلمان۔ عزیز و اقارب مسلمان۔ دوست احباب مسلمان ہماری مسلمانی کے لئے اور کون سا ثبوت چاہیئے آپ کو! لیکن آپ کی یہ خندہ زیر لبی کیسی! ہم نے کچھ غلط تو نہیں کہا۔ ہمارے دلوں کو تو یہ اطمینان بھی حاصل ہے کہ اللہ کی بارگاہ میں بخشش بھی ہماری ہو گی کیوں کہ اس نے مسلمانوں کے لئے ہی جنت بنائی ہے۔ ہم اللہ کی بخشش پا کر جنت میں داخل ہوں گے۔ ہمارے بغیر جنت بھرے گی کیسے؟ اس کا مصرف کیا رہ جائے گا؟ تو جناب ہماری مسلمانی تو پکی ٹھہری۔ آپ اپنی بات کیجیے۔ کیا فرمایا آپ نے قرآن ہم نے پڑھا؟ بھئی حد کر دی آپ نے۔ ہم مسلمان ہو کر قرآن نہیں پڑھیں گے؟ ایک دفعہ نہیں ہزاروں دفعہ پڑھ چکے ہیں۔ ہمیشہ پڑھتے ہیں۔ گھروں میں خوشی و غمی کے ہر موقع پر ختم قرآن کی محفلیں ہوتی ہیں۔ باہر سوسائٹی میں جو تقاریب منعقد ہوتی ہیں، جو اجلاس بلائے جاتے ہیں جو کانفرنسیں کی جاتی ہیں سب کا آغاز قرآنِ پاک پڑھنے سے ہی تو ہوتا ہے۔ آپ کو معلوم نہیں کیا؟ کہ رمضان المبارک میں جتنا قرآن پڑھا جاتا ہے۔ سنا جاتا ہے۔ ساری دنیا میں کوئی کتاب اتنی دفعہ نہ پڑھی گئی ہو گی۔ نہ سنی گئی ہو گی آپ تو اس کی مثال نہیں پیش کر سکتے۔ قرآن تو ہماری جان کے ساتھ ہے۔ زندگی میں ہم اس کا ایک ایک حرف دہرا کر بلکہ صرف اس کے اوپر انگلی پھیر کر دس دس بیس بیس نیکیاں کماتے ہیں اور ہماری موت کو آسان کرنے کے لئے سورۂ یٰسین موجود ہے۔ وہ پڑھی جاتی ہے تو ہماری اٹکی ہوئی جان چھٹکارہ پا لیتی ہے۔ پھر مرنے کے بعد قُل شریف ہوتے ہیں ان میں جتنی زیادہ دہرائیاں قرآن کی ہوتی ہیں اتنا ہی زیادہ بلکہ دس گنا زیادہ مرنے جینے والوں کو ثواب ملتا ہے۔ اور آپ پوچھ رہے ہیں کہ ہم قرآن پڑھتے ہیں کیا؟

قرآن ہی تو ہمارا ایمان ہے۔ جتنی عزت تعظیم ہم اس کی کرتے ہیں جتنی محبت ہمیں قرآن پاک سے ہے آپ کو نظر نہیں آتی کیا؟ ہم اسے نہایت خوبصورت غلافوں میں لپیٹ کر گھر میں سب سے اونچی جگہ اسے رکھتے ہیں۔ باوضو ہو کر اسے آنکھوں سے لگاتے ہیں۔ لبوں سے چومتے ہیں۔ اس کی آیات کو تعویذ بنا کر گلے میں لٹکاتے ہیں۔ بطور لاکٹ پہنتے ہیں۔ ہم اس کے علاوہ بھی خدا کے کلام کا بڑا احترام کرتے ہیں۔ ہم اسے سونے چاندی کی تاروں سے لکھتے ہیں نقش ونگار سے آراستہ کرتے ہیں یوں ہم اللہ تعالیٰ کی اس عظیم کتاب کو منوں وزنی بنا کر اس کو مزید عظمت دینے کی سعادت حاصل کرتے ہیں۔

سن رہے ہیں آپ ہماری بات؟ پھر آپ کی یہ ہنسی چہ معنی دارد؟ اچھا آپ نے قرآن کی آیت دہرائی ہے۔ اب ہمیں کیا پتہ کہ آپ نے کیا کہا ہے اور آپ کیا بتانا چاہتے ہیں۔ اس کا مطلب بتائیں تو ہم بھی کچھ سمجھیں۔ ہماری زبان عربی تو نہیں کہ ہم یہ بھی جان جائیں کہ قرآن میں کیا لکھا ہے۔ ہم تو مسلمان ہونے کے ناطے ثواب حاصل کرنے کے لئے قرآن کے الفاظ پڑھتے ہیں۔ جیسا کہ ہم نے پہلے بتایا ہم خدا کے فضل سے مسلمان ہیں ہم اللہ اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) اور اسکی آخری کتاب پر ایمان رکھتے ہیں۔ کیا کہا آپ نے؟ ہمارا یہ ایمان ایمان نہیں! کیوں کہا آپ نے۔ آپ نہیں کہہ رہے قرآن کہہ رہا ہے۔ اچھا! آپ سنائیں ہم سن رہے ہیں۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا آمِنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ وَالْكِتَابِ الَّذِي نَزَّلَ عَلَىٰ رَسُولِهِ وَالْكِتَابِ الَّذِي أَنزَلَ مِن قَبْلُ ۚ وَمَن يَكْفُرْ بِاللَّهِ وَمَلَائِكَتِهِ وَكُتُبِهِ وَرُسُلِهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلَالًا بَعِيدًا۔

ہاں تو پہلے آپ کو اس پوری آیت کا مفہوم بتا دیا جائے۔ اللہ فرماتا ہے "اے ایمان والو! ایمان لاؤ اللہ پر اس کے رسول پر اس کتاب پر جسے خدا نے اپنے رسول پر نازل کیا تھا اور ان تمام کتابوں پر ایمان جو اس نے اس سے پہلے نازل کی تھیں اور ملائکہ اور حیات اُخروی پر ایمان اور یاد رکھو! کہ جو شخص ان سب سے انکار کرتا ہے۔ تو وہ زندگی کے صحیح راستے سے بہت دور جا پڑتا ہے۔" آپ نے دیکھا کہ اس آیت میں اللہ نے ایمان والوں کو مخاطب کر کے حکم دیا ہے کہ ایمان لاؤ اللہ پر اس کے رسول پر.....

یہ کیا بات ہوئی! بات یہ ہوئی کہ اس سے ہمارے سامنے یہ حقیقت آئی کہ محض مسلمان گھرانوں میں پیدا ہو جانے سے ہم ایمان والے نہیں کہلا سکتے اور صرف پیدائشی مسلمان ہونا ہمارے لئے وجہ سرفرازی نہیں بن سکتا۔ ایمان تو وہ آئیڈیالوجی ہے نظریۂ صداقت وہ نصب العین حیات ہے جس کو پورے غور و فکر کے ساتھ سوچ سمجھ کر اپنے قلب و ذہن کی رضا مندی سے قبول کرتا ہوتا ہے۔ یہ نہیں کہ مسلمان ماں باپ کے گھر پیدا ہو جانے سے بغیر کچھ جانے بوجھے اپنے آپ کو مسلمان سمجھ لیا

اور مطمئن ہو بیٹھے اور پھر اسی خود فریبی میں عمر گنوا تے چلے گئے۔ اللہ تو علیم و خبیر ہے ہر ہر بات کا وہ اپنے بندوں کی ہر نیکی بدی کو جانتا ہے۔ محض پیدائشی یا نام کے مسلمان ہو کر ہم اسے فریب نہیں دے سکتے۔ اسی لئے اس نے بظاہر ایمان رکھنے والوں کو یہ حکم دیا کہ ایمان لاؤ۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہمارا یہ سارا دعویٰ پانی کا بلبلہ ہی تھا اور پیدائشی مسلمان ہونا ایمان کے لئے کافی نہیں! جی ہاں درست بات یہی ہے جو آپ نے اب سمجھی ہم آپ تو ایک طرف۔ خود رسول کو بھی اپنے اوپر نازل ہونے والی وحی پر ایمان لانا ہوتا تھا جیسا کہ قرآن کہتا ہے: اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَ الْمُؤْمِنُوْنَ۔ رسولؐ اور جماعت مومنین ان صداقتوں پر ایمان لاتے ہیں جو خدا کی طرف سے بذریعہ وحی رسولؐ پر نازل ہوتی ہیں، اور پھر رسولؐ سے بھی اپنے ایمان کا اعلان کرنے کے لئے کہا گیا ہے: قُلْ اٰمَنْتُ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنْ كِتٰبٍ۔ "اے رسولؐ! تم کہو کہ میں خدا کی طرف سے نازل شدہ کتاب پر ایمان لایا ہوں"۔ سورۃ الفرقان میں خداوند کریم نے ایمان کے متعلق یہ چیز واضح کر دی ہے کہ وہ صداقت اور حقیقت کو غور و فکر کے بعد تسلیم کرنے کا نام ہے۔ اس سے ہم آپ اپنے ایمان کی حقیقت کا اندازہ کر سکتے ہیں! رسماً زبان سے چند الفاظ دہرا دینے اور اصطلاح امت مسلمہ سے وابستہ ہو جانے کا نام تو نہیں۔ قرآن حکیم تو ہمیں یہ بتاتا ہے کہ حقیقی مومن وہ ہیں جو اللہ اور اس کے رسولؐ پر ایمان لاتے ہیں اور اس نظریۂ حیات کی صداقت کے متعلق ان کے دل میں کسی قسم کا شک یا اضطراب پیدا نہیں ہوتا اور وہ اللہ کی راہ میں اپنی جان اور مال سے مصروفِ جدوجہد رہتے ہیں تو یہ ہیں وہ لوگ جو اپنے دعویٰ کو اپنے عمل سے سچا کر دکھاتے ہیں۔ ہم نے آپ نے پیدائشی مسلمان ہونے کا ڈنکا تو بجا دیا لیکن کبھی اپنے اعمال و کردار پر نظر نہ ڈالی کہ وہ کہاں تک ایمان کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ اور احکام قرآن کے تابع رہتے ہیں۔ نہ کبھی یہ سوچنے کی زحمت کی کہ انسانی اعمال اور ایمان کا باہمی رشتہ کیا ہے۔ قرآن کا تو یہ اعلان ہے کہ خدا لوگوں کے خالی دعوائے ایمان کی بناء پر ان کا دوست اور کارساز نہیں ہوتا بلکہ هُوَ وَلِيُّهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ۔ وہ ان کے اعمال کی وجہ سے ان کا دوست ہوتا ہے۔ یہ "ایمان بلا عمل" والے کون ہیں؟ آیئے تو ذرا اپنے گریبانوں میں جھانک کر دیکھیں۔ کیا ہم نہیں؟ کیا یہ ہمارے لئے نہیں کہا گیا کہ وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَ بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ مَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ۔ لوگوں میں سے وہ بھی ہیں جو کہتے ہیں کہ ہم اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتے ہیں۔ لیکن وہ مومن ہوتے نہیں۔ اسی حقیقت کو ہمارے اقبالؒ نے ان الفاظ میں بیان کیا تھا۔ ؎ مردہ آں ایمان کہ ناید در عمل۔ اور دوسری حقیقت ہمارے آپ کے تعلق سے یہ ہے کہ ہمارے کاروبارِ حیات میں ایمان کی اثر اندازی کہیں نظر نہیں آتی۔ قرآن

کریم میں لکھی ہوئی اقدار اس کے بتائے ہوئے ضابطے اس کے دیئے ہوئے احکام و قوانین کا ہم وظیفوں کی صورت میں ورد تو کر لیتے ہیں لیکن ان کو اپنی عملی زندگی میں داخل کرنے کا ہمیں خیال تک نہیں آتا۔ مثلاً قرآن پاک کا ارشاد ہے کہ لَعْنَتَ اللّٰهِ عَلَى الْكَاذِبِيْنَ (۳/۶۱) جھوٹوں پر خدا کی لعنت ہے۔ اس نصِ صریح کے باوجود ذرا خدا لگتی کہیئے ہم میں سے کتنے ہیں جو اپنے معمولات زندگی میں جھوٹ سے اجتناب کرتے ہوں اور صبح سے شام تک جھوٹ سے کام نہ لیتے ہوں۔ آٹے میں نمک کے برابر بھی نہیں۔ ہمیں مکر و فریب کی بنائی ہوئی جھوٹی باتوں سے بچنے کا حکم ہے۔ اِجْتَنِبُوْا قَوْلَ الزُّوْرِ (۲۲/۳۰) لیکن اس کے برعکس ہم میں سے ۹۹ فیصد کا شعار زندگی تصنع۔ بناوٹ۔ چالبازی اور دھوکہ دہی ہے۔ ارشادِ خداوندی ہے کہ لَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَ تَكْتُمُوا الْحَقَّ (۲/۴۲)

نہ تو حق کو چھپاؤ اور نہ ہی حق و باطل کو گڈ مڈ کرو۔ ہمارا ہر روز کا یہی وطیرہ ہے۔ قرآن ہمیں یہ رہنمائی دیتا ہے کہ اِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوْا (۶/۱۵۲) ہماری راہِ عمل یکسر اس کے خلاف ہوتی ہے۔ ارشادِ باری ہے اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى (۵/۸)

ہمیشہ عدل کرو کیونکہ عدل کرنا تقویٰ سے قریب تر ہے۔ جبکہ ہمارے معاشرے کا یہ حال ہے کہ عدل و انصاف نام کی شے کہیں دور دور تک دکھائی نہیں دیتی۔ تقویٰ ہم کہاں سے حاصل کریں گے؟ ایمان کا تقاضا تھا کہ اَوْفُوْا بِالْعَهْدِ اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُوْلًا (۱۷/۳۴) ہمیشہ وعدہ پورا کرو کہ تم سے اس کے متعلق بازپرس ہوگی کہ تم نے وعدہ کر کے پورا کیا تھا؟ اُدھر ہم ہیں کہ ہم نے وعدے کو مذاق بنا رکھا ہے وعدہ کرتے ہیں اور بھول جاتے ہیں۔ یا بڑے سے بڑے مزے سے بہانا اڑا دیتے ہیں کہ وہ وعدہ ہی کیا جو وفا ہو گیا! حکم ملا تھا کہ لَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ اِنَّ السَّمْعَ وَ الْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُوْلًا۔ (۱۷/۳۶) جس بات کا تمہیں علم نہ ہو اس کے پیچھے مت لگ جایا کرو یاد رکھو! تمہاری سماعت، بصارت اور قلب سے پوچھا جائے گا کہ جو بات تم نے سنی تھی اسے آگے پھیلانے سے پہلے یہ تحقیق کر لی تھی کہ وہ سچی بھی ہے یا نہیں؟ ادھر ہم "مومنین" کا یہ حال ہے کہ سنی سنائی باتوں ادھر سے ادھر نہ جب تک پہنچا لیں ہماری تو روٹی ہی ہضم نہیں ہوتی۔ اس سے معاشرے میں شر کی جو چنگاریاں اڑتی اور پھیلتی ہیں ہم انہیں دیکھتے ہی نہیں۔ اپنی آنکھیں بند کر لیتے ہیں قرآن کریم نے کہا تھا کہ اَوْفُوا الْكَيْلَ اِذَا كِلْتُمْ وَزِنُوْا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِيْمِ (۱۷/۳۵)

جب کوئی ماپ کرو تو ماپ پورا رکھو اور جب تول کرو تو تول پورا کرو۔

اپنی خرید و فروخت میں اس حکم خداوندی پر کتنا عمل ہوتا ہے۔ اس کو بتانے کی ضرورت نہیں۔ کچھ چھپا ڈھکا نہیں۔ کھلے بندوں بددیانتی کی جاتی ہے اور ایمان

رکھنے کا دعویٰ کرتے ہوئے بے ایمانی سے کام لیا جاتا ہے۔ اَوْفُوا الْكَيْلَ کے معنی یہ ہیں کہ خریدار سے جو کچھ لو اس کے بدلے میں اس کی مطلوبہ شے خالص اور پوری پوری دو۔ کیا ہم پیدائشی مسلمانوں کے بازاروں میں اپنے داموں کے عوض خالص اور پوری شے ملنے کا دستور ہے؟ ہدایت ہمیں یہ ہوئی تھی کہ لَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ (۲/۱۸۸) ایک دوسرے کا مال ناجائز طریقے سے نہ کھاؤ: وَتُدْلُوا بِهَا إِلَى الْحُكَّامِ لِتَأْكُلُوا فَرِيقًا مِّنْ أَمْوَالِ النَّاسِ بِالْإِثْمِ (۲/۱۸۸) نہ ہی حکام کو رشوت دیکر دوسروں کا حق غصب کرو۔ ہمارے ہاں کیا ہو رہا ہے۔ رشوت خیانت ہمارے کاروبار کے بنیادی عناصر بن چکے ہیں۔ آخر ہم کس منہ سے اپنے مسلمان ہونے پر فخر کرتے ہیں اور کس ایمان کی بات کرتے ہیں۔ کیا ہم نے حسد کرنا چھوڑ دیا۔ بدگمانی و غیبت سے منہ موڑ لیا۔ تہمت لگانے اور بہتان باندھنے سے مجتنب ہو گئے۔ غصّے کی حالت میں اپنے اوپر ضبط کرنا سیکھ لیا۔ بات بات پہ بھڑک اٹھنا ترک کر دیا! کیا ہم نے منافقت سے دامن چھڑا لیا! والدین۔ رشتے داروں۔ ہمسایوں۔ دوست احباب سے حسن سلوک کرنا اپنا شعار بنا لیا! تکریم آدمیت کا اصول اپنا لیا! کیا یہ سب قسم کی ناہمواریاں ہماری معاشرت میں موجود نہیں؟ ہیں یقیناً ہیں! تو پھر مسلمانی کیسی؟ ہمارا ایمان کیا؟ شاید آپ کہیں کہ چھوٹی چھوٹی باتوں سے بھلا ہمارے ایمان کو کیا زد پہنچتی ہے۔ اگر آپ ایسا سوچتے ہیں تو یہ آپ کی سب سے بڑی بھول ہے کیونکہ کردار انسانی کی تعمیر روزمرہ کی چھوٹی چھوٹی باتوں سے ہی شروع ہوتی ہے اور کردار کے بغیر ایمان کی تکمیل نہیں ہوتی۔ یاد رکھیئے اقدارِ قرآنی اختیار کرنے سے ہی ہمارے ایمان کا عملی مظاہرہ ہو سکتا ہے اور یہ آیات ربانی کو شعارِ زندگی بنا کر ہی ہم اپنے سچے مسلمان ہونے کا ثبوت دے سکتے ہیں اس کے سوا کوئی دوسرا راستہ نہیں۔ اگر ہم یہ جان لیں کہ ہم سب پیدائشی مسلمانوں کو قرآنی مسلمان بننے کی ضرورت ہے تو ہماری سب مشکلیں آسان ہو جائیں۔ واللہ المستعان۔

راقمہ

ثریا عندلیب۔ ۱ جولائی ۱۹۸۵ء

— ⁂ —

محرم کے بغیر عورت کا سفر کرنا

آج کل اخبارات میں اس مسئلہ پر گرما گرم بحث جاری ہے کہ کیا ایک مسلمان عورت، محرم کے بغیر اکیلی یا دوسرے غیر محرموں کے ساتھ سفر کر سکتی ہے۔ محرم سے مراد ایسا قریبی رشتہ دار ہوتا ہے کہ جس سے اس عورت کی شادی شرعاً جائز نہ ہو جیسے بھائی وغیرہ۔ اس بحث کی صدائے بازگشت قومی اسمبلی میں بھی سنی گئی اور ۱۳ جون ۱۹۸۵ء کے قومی اخبارات کے مطابق، ایک رکن اسمبلی نے تو یہاں تک فرما دیا کہ حدیث شریف کے مطابق اگر کوئی عورت ایک دن کا سفر بھی بغیر محرم کرے گی تو اس کا نکاح ٹوٹ جائے گا۔ اس پر اسمبلی کی ممبر خواتین نے ایوان سے احتجاجاً واک آؤٹ کیا۔ جب خود بعض علماء حضرات نے اس کی تردید کی کہ اس مضمون کی کوئی حدیث موجود نہیں تو کچھ دنوں کے بعد متعلقہ رکن اسمبلی کا یہ بیان اخبارات میں چھپا کہ ان کی طرف جو تقریر منسوب کی گئی ہے، وہ اسمبلی کے ریکارڈ میں موجود نہیں۔ لیکن انہوں نے یہ وضاحت نہ فرمائی کہ خواتین ممبر اسمبلی نے پھر کس وجہ سے ایوان سے واک آؤٹ کیا تھا

اس بحث کا اصل آغاز قرآن اکیڈمی والے ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے کیا تھا، انہوں نے ٹیلی ویژن کے پروگرام، روبرو میں انٹرویو دیتے ہوئے ایک سوال کے جواب میں فرمایا تھا کہ چونکہ پی آئی اے میں ائیرہوسٹسوں کو غیر محرم مردوں کے درمیان سفر کرنا پڑتا ہے اس لئے ان کی ملازمت شرعاً جائز نہیں۔

طلوعِ اسلام کے بہت سے قارئین نے اس بارے میں اپنی پریشانی کا ذکر کیا ہے اور اس بارے میں قرآنِ مجید کی رہنمائی طلب فرمائی ہے۔

قرآنِ مجید نے مردوں اور عورتوں کو ہر معاملے میں اور ان کے مختلف حقوق میں برابر کی حیثیت کا تسلیم کیا ہے۔ قرآنِ مجید میں کوئی ایسا حکم موجود نہیں کہ جس کی رُو سے عورتوں کو محرم کے بغیر سفر کرنے سے منع کیا گیا ہو۔ بلکہ سفر کرنے والے مردوں اور سفر کرنے والی عورتوں کو یہ حکم دیا گیا ہے۔ کہ جب وہ گھر سے باہر جائیں، تو اپنی نظریں نیچی رکھیں، ایک دوسرے کو نہ تو گھوریں اور نہ ہی ایک دوسرے کے سامنے اپنی زینت کا اظہار کریں۔

محرم والی شرط کا ذکر احادیث اور فقہ کی کتابوں میں ملتا ہے۔ لیکن افسوس سے کہنا پڑتا ہے

کہ ڈاکٹر اسرار احمد صاحب سمیت جو لوگ اس بارے میں فتوے جاری کر رہے ہیں انہوں نے اس بارے میں احادیث اور فقہ کی کتابوں کا بھی پوری طرح مطالعہ نہیں کیا، کیونکہ جس فتویٰ کو وہ پیش کر رہے ہیں وہ صرف حنفی فقہ کا فتویٰ ہے۔ دوسرے ائمہ فقہ جن میں حضرت عائشہؓ امام مالکؒ، امام شافعیؒ اور امام ابن حزمؒ شامل ہیں۔ محرم کے بغیر عورت کو سفر کرنے کی واضح اجازت دیتے ہیں۔ امام بخاری جن کا تعلق شافعی فقہ سے تھا وہ تو کتاب الحج کی ابتداء ہی ایک ایسی حدیث سے کرتے ہیں، کہ جس کے مطابق عورتیں بغیر محرم کے حج کر سکتی ہیں۔ فقہا کے فتاویٰ نقل کرنے سے پہلے ضروری معلوم ہوتا ہے، کہ اس موضوع پر جو احادیث ملتی ہیں ان کا ذکر کر دیا جائے۔

اس موضوع پر کوئی ایک درجن احادیث ملتی ہیں۔ کہ کوئی مسلمان عورت اپنے محرم کے بغیر سفر نہیں کر سکتی۔ اس کے لئے مختلف احادیث میں مختلف میعادیں مقرر کی گئی ہیں۔ جن کی تفصیل یہ ہے۔

(۱) تین گھنٹے سے زائد کا سفر
(۲) ایک دن کا سفر
(۳) ایک دن اور ایک رات کا سفر
(۴) دو دن اور دو راتوں کا سفر
(۵) تین دن سے زائد کا سفر

حنفی فقہ کے فقہاء نے پہلی چار میعادوں کے بارے میں تمام احادیث کو ضعیف قرار دیتے ہوئے، صرف آخری میعاد والی حدیث کو تسلیم کیا ہے، ان کے فتویٰ کے مطابق کوئی مسلمان عورت تین دن سے زیادہ سفر محرم کے بغیر نہیں کر سکتی۔ اس سفر کا اصل اطلاق تو سفر حج پر ہونا تھا لیکن دوسرے سفروں کو بھی اس پر قیاس کیا جاتا ہے، اس بارے میں حنفی فتویٰ کے اصل الفاظ ملاحظہ ہوں:۔

وقالت الحنفية إنّ المنع مقيّد بالثلاث لانه متحقق وما عداه مشكوك فيه فيوخذ بالمتيقن

ترجمہ: حنفی فقہا کا فیصلہ یہ ہے کہ بغیر محرم کے سفر پر پابندی تین دنوں والی روایت سے ثابت ہے اور اس کے علاوہ جتنے اقوال ہیں وہ سب ضعیف ہیں۔

(نیل الاوطار جلد چہارم ص ۳۰۶)

یہ تو تھا حنفی فقہ کا فتویٰ، اس کے مقابلے میں امام مالک اور امام شافعی بغیر محرم کے سفر کی واضح اجازت دیتے ہیں۔ ان کے فتویٰ کے الفاظ یہ ہیں۔

وقال مالك والشافعي ليس من شرط الوجوب ذالك وتخرج

المرأۃ الی الحج اذا وجدت رفقۃً مامونۃً

(بدایۃ المجتہد جلد اوّل ص ۳۱۱)

ترجمہ :- اور امام مالکؒ اور امام شافعیؒ نے یہ فرمایا ہے کہ حج پر جانے کے لئے عورت کے لئے محرم کی شرط نہیں ہے، اور جب ہی اسے با اعتماد ساتھی ملیں وہ حج پر جا سکتی ہے۔

ام المومنین حضرت عائشہؓ کا بھی یہی فتویٰ تھا ان کا فتویٰ ان الفاظ میں نقل کیا جاتا ہے :-

ذکر عند عائشۃ ام المومنین المرأۃ لا تسافر الا مع ذی محرم
قالت عائشۃ لیس کل نساءٍ تجد محرمًا

(المحلی لابن حزم جلد ۷ صفحہ ۴۷)

ترجمہ :- ام المومنین حضرت عائشہ کے پاس اس حدیث کا ذکر کیا گیا ہے کہ عورت اپنے محرم کے بغیر سفر نہیں کر سکتی تو آپ نے (اس حدیث کی تردید کرتے ہوئے) فرمایا کہ ہر عورت کے لئے یہ ممکن نہیں کہ اس کے ساتھ محرم ہو۔

امام ابن حزم کا بھی یہی فتویٰ تھا اور اپنے فتویٰ کے ساتھ وہ اس امر کی بھی تصریح کرتے ہیں کہ بہت سے فقہاء کی یہی رائے ہے۔ ان کے اپنے الفاظ ہیں :-

وَ اَمَّا المرأۃُ التی لا زوج لَہا وَ لا ذا محرم یحجّ معہا فانہا تحجّ و لا شیءَ عَلَیہا۔ وَ قالت طَائفَۃٌ تحجّ فی رفقۃ مامونۃٍ وَ اِن لَّم یکُنْ لہا زوجٌ وَ لا کان معہا ذو محرم (ایضاً)

ترجمہ :- جس عورت کا خاوند یا کوئی دوسرا محرم نہیں کہ جس کے ساتھ وہ حج کرے تو اس صورت میں وہ بغیر محرم کے حج کر سکتی ہے اور اس پر کوئی گناہ نہیں۔ اور فقہا کی ایک جماعت نے فتویٰ دیا کہ وہ اپنے اعتبار کے ساتھیوں کے ساتھ سفر کر کے حج کر سکتی ہے۔ اور اس کے ساتھ بے شک اس کا خاوند یا کوئی دوسرا محرم بھی نہ ہو۔

دراصل مختلف فقہاء کے فتاویٰ میں اختلاف کی وجہ یہ ہے کہ دونوں قسم کی احادیث ملتی ہیں۔ بعض احادیث میں بغیر محرم کے سفر کرنے کی ممانعت ہے جب کہ دوسری احادیث میں اس کی واضح اجازت ہے اور مختلف فقہا نے اپنی اپنی تحقیق کے مطابق ان احادیث کے مطابق فتاویٰ جاری کئے ہیں۔

امام بخاری جن کا تعلق شافعی فقہ سے تھا نے اپنی کتاب صحیح بخاری میں دونوں قسم کی احادیث نقل کی ہیں لیکن انہوں نے بھی ان احادیث کو ترجیح دی جس میں محرم کے بغیر حج کا سفر اختیار کیا جا سکتا ہے۔ انہوں نے صحیح بخاری کی کتاب الحج کی ابتداء ہی ایک ایسی حدیث سے کی ہے کہ جس کے مطابق حج کے سفر کے لئے محرم کی ضرورت نہیں۔ اس

حدیث کے مطابق قبیلہ خثعم کی ایک خوبصورت عورت نے بغیر محرم کے حج ادا کیا۔ حج ادا کرنے کے بعد وہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی اور عرض کیا کہ اس کا باپ بہت بوڑھا ہے، جو اونٹ پر سوار نہیں ہو سکتا۔ کیا وہ اپنے باپ کی جگہ دوسرا حج کر سکتی ہے، تو آپؐ نے اسے ایسا کرنے کی اجازت دے دی۔

(صحیح بخاری مترجم حامد اینڈ کو، اردو بازار لاہور جلد اول صفحہ ۵۷۰)

اس سلسلے کی ایک اور مشہور حدیث بھی ہے، جس کا فقہا نے خاص طور پر ذکر کیا ہے، اس حدیث کے راوی حضرت عدی بن حاتم ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ ایک دفعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایک وقت ایسا آئے گا، کہ ایک خوبصورت عورت حیرہ کے مقام سے خانہ کعبہ تک اکیلی سفر کرے گی اور اسے خدا تعالیٰ کے سوا کسی کا ڈر نہ ہوگا۔

(عین الہدایہ اردو جلد اوّل صفحہ ۹۴۴)

عورتوں کو بغیر محرم سفر کرنے سے روکنے والے اہل علم کے سامنے جب یہ احادیث اور دوسرے ائمہ فقہ کے فتاویٰ پیش کئے گئے، تو انہوں نے عقلی دلائل دیتے ہوئے کہا کہ دراصل اس قسم کی اجازت یعنی بغیر محرم کے سفر کرنے سے معاشرے میں فحاشی پھیل سکتی ہے۔ اس لئے انہیں روکنے کے لئے یہ کہا گیا ہے کہ چونکہ محرم کے بغیر سفر کرنا خلاف اسلام ہے اس لئے ایسا سفر کرنے سے ان کا نکاح ٹوٹ سکتا ہے، لیکن ایسا استدلال کرنے والے اہل علم نے اس امر کا خیال نہیں کیا کہ فاحشہ اور بدکار عورتیں، ان کے اس عجیب و غریب فتویٰ کا غلط استعمال بھی کر سکتی ہیں۔ اب تو ایسی عورتوں کو، اپنے خاوندوں سے علیحدگی حاصل کرنے کے لئے عدالت کا دروازہ کھٹکھٹانا پڑتا ہے لیکن اس فتویٰ کی آڑ میں وہ بڑی آسانی سے اپنے خاوندوں سے گلو خلاصی کرا لیں گی، وہ دانستہ ایک دن کیلئے بغیر محرم کے سفر کرکے اپنے آپ کو نکاح کی قید سے آزاد سمجھنے لگ جائیں گی۔ یہ صورت حالات معاشرے میں فحاشی ختم کرنے کی بجائے اس میں اضافے کا سبب بن جائیگی۔

اسلام نے عورتوں کو جو حقوق دیئے ہیں، انہیں اب ان حقوق کا شعور حاصل ہو گیا ہے اور وہ انہیں حاصل کرنے کی کوشش کر رہی ہیں، علماء حضرات، جو ان حقوق کے بارے میں سنی سنائی باتوں پر اکتفاء کرتے ہوئے اپنے فتوے جاری کر دیتے ہیں، ان سے درخواست ہے کہ وہ عورتوں کے اسلامی حقوق اور ان کی ذمہ داریوں کے بارے میں اسلامی احکام کا اچھی طرح مطالعہ کر کے، کسی مسئلہ کی بابت اپنی زبان کھولیں۔ اس سے انہیں بعد میں کسی ناپسندیدہ صورتِ حالات کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔

(محمد ارمغان ثاقب)

علامہ پرویز صاحب داغِ مفارقت دے گئے

جنوبی افریقہ سے شائع ہونے والے اسلامی اخبار البلاغ کے ایڈیٹر عطاء اللہ جمل صاحب نے علامہ پرویز صاحب کی وفات پر اپنے اخبار کی جون ۱۹۸۵ء کی اشاعت میں مندرجہ ذیل اداریہ سپردِ قلم کیا ہے۔ اصل اداریہ انگریزی زبان میں ہے، جس کا اردو ترجمہ قارئین طلوعِ اسلام کی خدمت میں پیش کیا جاتا ہے۔

(ادارہ)

۲۴ فروری ۱۹۸۵ء کو شام کے چھ بجے ایک ایسی مصیبت نازل ہوئی کہ جس سے اسلامی دنیا پر اندھیرا چھا گیا۔ یہ مصیبت علامہ پرویز کی وفات کا صدمہ تھا۔

علامہ پرویز صاحب ہمہ صفت انسان تھے، وہ دانشور، غیر مقلد، بت شکن اور بے مثال انسان تھے۔ قرآنی فکر کی سمجھ میں علامہ اقبالؒ کے بعد ان کا کوئی ثانی نہیں تھا۔ پاکستان اور ہندوستان کے ایک ہزار مولویوں نے ان کے خلاف کفر کا فتویٰ دیا (اور کون ان کے کفر کے فتویٰ سے بچ سکا ہے)۔ اس فتویٰ سے پرویز صاحب کی عظمت کا اندازہ ہوسکتا ہے!

وہ اسلامی علوم کے میدان کا ایک دیو قامت انسان تھا، جسے بونے اور گھٹیا قسم کے لوگوں نے تباہ کرنے کی کوشش کی، لیکن انہیں ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ علامہ پرویز نے ان مخالفتوں کی ذرہ بھر پرواہ نہ کی، وہ مشکل سے مشکل اوقات اور حالات میں پرسکون اور خاموش رہا جب کہ گھٹیا قسم کے لوگ ان پر کیچڑ اچھالتے رہے اور گالیاں دیتے رہے۔

مطالعہ فطرت اور وسیع علم کی بناء پر انکی شخصیت ایسی پرشکوہ تھی کہ احتراماً ان کے آگے سر جھک جاتا تھا۔ وہ کسی فلسفی کے اس قول کہ گہرے دریا خاموش شان سے بہتے ہیں: جب کہ تھوڑے پانی والی ندیاں شور مچاتی ہیں، کی زندہ مثال تھے۔

پرویز صاحب قائدِ اعظمؒ محمد علی جناحؒ کے مستقل ساتھی تھے۔ وہ آپ سے اسلامی مسائل کے بارے میں مشورہ کرتے رہتے تھے۔ علامہ شبیر احمد عثمانی کے علاوہ، پرویز صاحب واحد شخصیت تھے جو وقت مقرر کئے بغیر قائدِ اعظمؒ سے ہر وقت مل سکتے تھے لیکن علامہ صاحب نے اس امتیازی اجازت کا کبھی ناجائز فائدہ نہ اٹھایا۔

(اس کا باقی حصہ صفحہ نمبر ۴۲ پر ملاحظہ ہو)

افکارِ پرویزؒ کی صدی (مسلسل)

محترم پرویز صاحب نے اس بیان کو نقل کرکے کہا۔

قوم اپنے لیڈروں سے پوچھتی ہے کہ جب آپ کو اتنے وثوق سے اس کا علم ہوچکا تھا کہ اتنا عظیم خطرہ مسلمانوں کے سروں پر منڈلا رہا ہے اور آپ کو اس کا بھی علم تھا کہ مونٹ بیٹن مسلمانوں کی حفاظت کا کوئی انتظام نہیں کرے گا بلکہ وہ شائد اس سازش میں خود شریک ہے تو آپ نے اپنی قوم کو اس قتل و غارت گری سے بچانے کے لئے کیا اقدامات کئے؟ کیا ان حالات میں آپ کا فریضہ محض اس قدر تھا کہ آپ لارڈ مونٹ بیٹن سے تحفظِ امن کا مطالبہ کرتے اور اس کے ٹال دینے پر عافیت کدوں میں آکر اطمینان اور بے فکری سے دادِ استراحت دیتے؟ آپ لارڈ مونٹ بیٹن کا دروازہ کھٹکھٹا سکتے تھے تو کیا آپ سوئے قوم آکر قوم کو آنے والے خطرہ سے آگاہ نہیں کرسکتے تھے کہ وہ از خود اپنی حفاظت کے سامان کرلے؟ جب تک قوم کو اس سوال کا اطمینان بخش جواب نہیں ملتا وہ اس نتیجہ تک پہنچنے میں بالکل حق بجانب ہے کہ مسلمانوں کے تمام قتل و غارتگری کا ذمہ دار بہ قومی نقطۂ نگاہ سے نہ مونٹ بیٹن ہے۔ نہ مرکزی حکومت۔ بلکہ اس بے گناہ دریائے خون کی ساری ذمہ داری ان راہنمایانِ قوم کے سر ہے جنہوں نے خطرہ کو بھانپا لیکن قوم کو بے خبر رکھا۔ جنہوں نے سیلابِ بلا اُمڈتا دیکھا اور قوم کو آگاہ کرنے کے روادار نہ ہوئے۔

آزاد پاکستان میں رمضان

رمضان کی آمد کے موقع پر خواجہ شہاب الدین صاحب وزیرِ داخلہ و نشریات کی طرف سے ایک بیان جاری ہوا "رویتِ ہلال اور آغازِ رمضان کی صحیح تاریخ سے متعلق غلطی کا امکان دور کرنے کے لئے حکومتِ پاکستان نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ مندرجہ ذیل علماء اور اربابِ مذہب ۲۹ شعبان (مطابق ۷ جولائی) کی شام کو جو فیصلہ صادر کریں گے اسے حکومت نشر کرے گی (علماء کے نام محذوف ہیں) علماء اور دیگر اصحابِ مذہب کراچی صدر بازار کی میمن مسجد میں ساڑھے سات بجے شام کو جمع ہونگے اور یہ فیصلہ کریں گے کہ آیا چاند ہوا یا نہیں۔ اس فیصلہ کو فی الفور اخبارات اور ریڈیو کے ذریعہ نشر کردیا جائے گا۔ (ڈان ۴ ۷/۴۸)

اس سلسلہ میں تبصرہ کرتے ہوئے محترم پرویزؒ صاحب نے لکھا۔ ہم خواجہ شہاب الدین صاحب سے اتنا پوچھنے کی جسارت کرتے ہیں کہ چاند دیکھنے یا اس کے نمودار ہونے سے متعلق فیصلہ کرنے کے لئے علماء کے پاس کون سی امدادی امتیازی شے تھی جو خود خواجہ صاحب، ان کے رفقائے کار یا دیگر حضرات کے پاس مفقود تھی کہ جس سے چاند دیکھنے

میں آسانی ہو۔ یا یہ گواہی لینے میں کہ کہیں چاند نظر آ گیا۔ یہ معاملہ اگر کسی ناظم رصدگاہ کے سپرد کر دیا جاتا تو بات قابلِ فہم بھی ہوتی کہ رصدگاہ میں ایسے آلات موجود ہیں جو چاند دیکھنے میں انسانی آنکھ کے مقابلے میں کہیں دور رس ہیں۔ اس مقصد کے لئے علما کے گروہ کا انتخاب و اختصاص ناقابلِ فہم ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ تخصیص اس نظریہ کی آئینہ دار ہے کہ امورِ مذہب تو علماء سے متعلق ہیں لہٰذا انہیں ہی ان کے متعلق فیصلے کرنے چاہئیں اور امورِ دنیا اربابِ حکومت کا فریضہ ہیں جس میں علماء کو دخل نہیں۔ چاند کی رویت کا فیصلہ یا تو خود دیکھنے سے ہو سکتا ہے یا ان اصحاب کی شہادت سے جنہوں نے چاند دیکھا ہو پہلی صورت میں علماء کی تخصیص بے کار ہے کیونکہ ہر صاحبِ نظر چاند دیکھ سکتا ہے اور اس باب میں کسی عالم کو کسی عامی پر۔ از روئے علمِ مذہب کوئی فوقیت نہیں۔ جہاں تک شہادتوں کا تعلق ہے اس کے لئے حکومت کے پاس اپنا نظام۔ عدالتی نظام۔ موجود ہے وہ نظام ایسا...... ہے کہ بڑے سے بڑے عالم کو بھی اپنے بیان کی تصدیق میں مجسٹریٹ کے سرٹیفکیٹ کی ضرورت پڑتی ہے لہٰذا اس معاملہ میں بھی علماء کو کوئی اختصاص و برتری حاصل نہیں۔ حکومت کا یہ نظامِ شہادت دیگر امور میں معتبر ہو سکتا ہے تو چاند کے معاملہ میں اسے کیوں غیر معتبر سمجھا جائے؟

ستمبر ۱۹۴۸ء (ستمبر اڈا، پر علامہ اقبالؒ کی ایک نظم "مردِ مسلمان" شائع کی گئی ہے۔ اس ماہ کے لمعات بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ جن میں لکھا ہے:۔

ہندوستان کی تحریکِ آزادی میں ہندوؤں کا دعویٰ یہ تھا کہ اس ملک میں بسنے والے تمام لوگ بلا تخصیصِ مذہب و ملت ایک قوم کے افراد ہیں اس لئے یہاں ایک "قومی حکومت قائم کرنی چاہیئے جو جمہوریت کے اصولوں پر کار فرما ہو۔ بعض مسلمان بھی ایسے تھے کہ جو اس نظریہ "متحدہ قومیت" میں ہندوؤں کے ہمنوا تھے انہیں نیشنلسٹ مسلمان کہا جاتا تھا۔

دوسری جماعت مسلم لیگ کی تھی جس کا ادعا یہ تھا کہ مسلمانوں کے نزدیک قومیت کا مدار اشتراکِ وطن نہیں بلکہ مذہب ہے تمام مسلمان بہ حیثیت مسلمان، ایک جداگانہ قوم کے افراد ہیں اس لئے وہ کسی دوسرے مذہب کے پیروؤں کے ساتھ مل کر متحدہ قوم نہیں بن سکتے ہندوستان میں نظامِ جمہوریت کے معنی یہ ہوں گے کہ یہاں اکثریت کی حکومت ہو۔ اور اکثریت کیونکہ ہندوؤں کی ہے اس لئے آزادیٔ ہند سے مفہوم ہوگا ہندوؤں کی حکومت اور مسلمانوں کی محکومیت۔ ان کے نزدیک اس گتھی کا حل یہ تھا کہ ہندوستان کے ان علاقوں کو جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے، الگ کر کے مسلمانوں کی جداگانہ حکومت قائم کی جائے۔ یہ تقسیمِ ہند کا نظریہ تھا جس کی مخالفت ہندو اور ان کے ہمنوا مسلم نیشنلسٹ حضرات کرتے تھے۔

دورانِ تحریک ایک تیسری آواز اٹھی جس نے یہ کہا کہ بےشک مسلمان، ہندوؤں کے ساتھ

مل کر ایک متحدہ قوم نہیں بن سکتے لیکن ہندوستان کے مسلمان، محض پیدائشی مسلمان ہیں جن کا مسلمان ہونا کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔ انہیں پہلے سچے معنوں میں مسلمان ہونا چاہیئے۔ اس کے بعد آزادی کے طالب۔ پیدائشی مسلمان، انگریز یا ہندوؤں کے غلام رہیں تو کیا اور اپنی الگ حکومت قائم کرلیں تو کیا۔ ان کی آزادی صحیح معنوں میں آزادی اسی صورت میں کہلا سکتی ہے جب یہ اپنے اندر اسلامی صفات پیدا کریں۔ اس نظریہ کے مدعیان نے آپنے آپ کو "اسلامی جماعت" کے نام سے متعارف کرایا۔

طلوع اسلام اس حد تک جماعت اسلامی کے ساتھ ہمنوا تھا کہ مسلمان صرف اسی صورت میں آزاد کہلا سکتا ہے جب یہ اپنی مملکت میں خدا کا قانون نافذ کرے۔ لیکن اس کا مسلک یہ تھا کہ خدا کے قانون کو نافذ کرنے کے لئے کسی خطۂ زمین کی ضرورت ہے۔ جب تک ہم ہندوستان میں کسی خطۂ زمین کے مالک نہیں بن جاتے اس وقت تک حکومت خداوندی کے قیام کا امکان نہیں۔ لہٰذا مسلم لیگ کی تحریک تقسیم ہندوستان کو کامیاب بنانے کے لئے ہمیں پوری پوری کوشش کرنی چاہیئے کیونکہ اس کی کامیابی سے ہمیں وہ امکانی قدرت حاصل ہو جائے گی جس سے اس زمین پر آسمان کی بادشاہت کا تختِ اجلال بچھ سکے۔ اگر ہم نے اس وقت تغافل برتا تو انگریز پورا ہندوستان ہندو کے سپرد کر دے گا جس سے ہمیں یہ امکانی قدرت حاصل نہ ہو سکے گی۔ ہمیں مسلم لیگ کی اس سیاسی تحریک کے ساتھ تعاون کرنا چاہیئے اور اس کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کو قرآن کے قریب لانے کی کوشش بھی جاری رکھنی چاہیئے۔[1]

لیکن "اسلامی جماعت" کے نزدیک یہ مسلک قابلِ قبول نہ تھا وہ "پیدائشی مسلمانوں" کے قومی اور اجتماعی مطالبات سے ہم آہنگی اور تعاون میں تعاون علی الاثم والعدوان (گناہ اور سرکشی کے معاملات میں تعاون) سمجھتی تھی۔ جس طرح سے مرزائی حضرات مسلمانوں سے روابط قائم کرنے میں کفر وفسق محسوس کرتے تھے چنانچہ اس جماعت نے اپنے آپ کو مسلمانوں کی اس تحریک سے عملاً الگ رکھا اور دوسروں کو اس سے الگ کرنے کی تلقین کرتے رہے۔ ان کا طرز عمل مسلمانوں کی اس اجتماعی تحریک کے لئے۔ نیشنلسٹ مسلمانوں سے بھی کہیں زیادہ ضرر رساں تھا اس لئے کہ نیشنلسٹ مسلمانوں کے نظریہ متحدہ قومیت کا بودا پن عوام کو بآسانی نظر آجاتا تھا لیکن ان کا یہ انداز گفتگو، جب تک مسلمان اپنے آپ کو سچے معنوں میں مسلمان نہیں بنا لیتا۔ جب تک یہ اپنے آپ کو اللہ کے رنگ میں نہیں رنگ لیتا۔ اس وقت تک انہیں کوئی فلاح وفوز حاصل نہیں ہو سکتی۔ مسلمانوں کے قومی لیڈروں کو دیکھو! ان میں کوئی اسلامی خصوصیات نظر نہیں آئے گی۔ ان کا فکر مغربی ٹکسال میں

---

[1] طلوع اسلام اسلامی جماعت کے وجود میں آنے سے بہت پہلے اس مسلک کی اشاعت کر رہا تھا۔

ڈھلا ہوا۔ ان کا عمل کفار اور مشرکین سے ملتا ہوا۔ کون سچا مسلمان ہے جو ان کی قیادت میں چلنا اپنے لئے باعثِ فخر سمجھے گا؟ اگر مسلمان اپنے اندر قوتِ ایمان پیدا کرے گا تو دنیا کی کوئی قوت اسے محکوم نہیں بنا سکے گی۔ لہٰذا ان ہنگامی تحریکوں کو چھوڑو اور مسلمان بننے کی کوشش کرو۔ عوام پر اپنا اثر کرتا جاتا تھا اور وہ بھول جاتے تھے کہ اس دلیل اور اس نتیجہ میں جس تک یہ جماعت ہمیں پہنچاتی ہے کوئی ربط نہیں۔

بہرحال وہ دور ختم ہوا اور نیشنلسٹ مسلمانوں کے نظریۂ "متحدہ قومیت" اور اسلامی جماعت کے مسلکِ اعتزال کے باوجود، مسلمانوں کو ایک خطۂ زمین مل گیا جس میں انہیں اپنے اندازِ فکر کے مطابق حکومت قائم کرنے کے امکانات حاصل ہو گئے ہیں۔ تقسیم ہند سے پہلے، اسلامی جماعت کا مرکز اس علاقہ (پٹھانکوٹ) میں تھا جو تقسیم کی رُو سے ہندوستان میں چلا گیا لیکن دیکھنے والوں کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب انہوں نے دیکھا کہ ان حضرات کو بھی وہاں کہیں پناہ نہ مل سکی اور انہیں اپنی حفاظت کے لئے اسی سرزمین کی طرف بھاگنا پڑا جس کے حصول کی جدوجہد سے تعاون و اشتراک کو اتنا بڑا گناہ قرار دیا کرتے تھے۔ ہم خیال کرتے تھے کہ خیر —— اب تو یہ لوگ اس حقیقت کا اعتراف کریں گے کہ تقسیم ہند کی تحریک ایسی "شجرِ ملعونہ" نہ تھی جیسی یہ لوگوں کو بتایا کرتے تھے اور جس سے احتراز و اجتناب عین خدمتِ اسلامی قرار دیا کرتے تھے۔ لیکن افسوس ہے کہ اعتراف کی انہیں اب بھی توفیق نصیب نہیں ہوئی۔ انہیں اس حقیقت کا اعتراف تو مجبوراً کرنا پڑ رہا ہے کہ

"ہم اس برعظیم ہند میں پچھلے دس سال سے اس بات پر لڑتے رہے ہیں کہ ہم اپنی ایک مستقل تہذیب الگ نظریۂ زندگی، اور مخصوص آئینِ حیات رکھتے ہیں ہمارے لئے مسلم و غیر مسلم کی ایک ایسی متحدہ قومیت ناقابلِ قبول ہے جس کا نظامِ زندگی لامحالہ ہمارے آئینِ حیات سے مختلف ہو گا۔ ہمیں ایک الگ خطۂ زمین درکار ہے جس میں ہم اپنے آئینِ زندگی کا نظام بنا اور چلا سکیں۔ ایک طویل اور انتھک کشمکش کے بعد بالآخر اب ہمیں[1] وہ خطۂ زمین مل گیا ہے جس کا ہم مطالبہ کر رہے تھے۔" (رسالہ ترجمان القرآن بابت جولائی ۱۹۴۸ء صفحہ ۱۵۰)

تقسیم ہند کے وقت، ہمارے اکابرین سے تدبر و سیاست کی بعض غلطیاں ہو گئیں جن کے نتائج بڑے ضرر رساں ثابت ہوئے۔ طلوعِ اسلام اپنی پہلی اشاعت (کراچی)

---

[1] اس ٹکڑے میں "ہم" اور "ہمیں" کے الفاظ قابلِ غور ہیں "ہم لڑ رہے تھے" "ہمیں ایک خطۂ زمین درکار تھا" ایک طویل اور انتھک کشمکش کے بعد بالآخر اب "ہمیں" وہ خطۂ زمین مل گیا جس کا "ہم" "مطالبہ کر رہے تھے" یہ ان کی طرف سے ہے جو اس مطالبہ کو لغو، اس جدوجہد کو مذموم اور اس کے ماحصل کو شجرۃ الزقوم قرار دیا کرتے تھے۔

سے اس وقت تک ان غلطیوں کو بار بار گنا رہا ہے اور ذمہ دار ارکان اقتدار کو مسلسل متنبہ کر رہا ہے کہ ان کا پھر اعادہ نہ ہونا چاہیئے۔ نیشنلسٹ مسلمان ان نتائج و عواقب کو تقسیم ہند اور جداگانہ قومیت کے نظریوں کا نتیجہ قرار دے کر۔ انہیں اپنے مسلک کی حقانیت کے جواز میں بطور دلیل پیش کر رہے ہیں۔ حالانکہ یہ ظاہر ہے کہ اگر میدان جنگ میں حربی تدبیر کی کسی غلطی سے فوج کو نقصان اٹھانا پڑے تو یہ اس امر کی دلیل نہیں ہو سکتا کہ جس مقصد کے لئے وہ فوج میدان جنگ میں آئی تھی، وہ مقصد باطل تھا۔

لیکن نیشنلسٹ مسلمانوں سے کہیں زیادہ حیرت انگیز مسلک "اسلامی جماعت" کا ہے۔ یہ اس جدوجہد کے ماحصل کو ایک بہت بڑی تبدیلی بھی قرار دے رہے ہیں۔ لیکن سال گذشتہ کے نقصانات کو اس مسلک کے بطلان کے لئے بطور دلیل بھی پیش کر رہے ہیں جس کا نتیجہ اتنی بڑی تبدیلی ہے اور جس سے ہمیں حکومت خداوندی کے قیام کی امکانی قدرت حاصل ہو گئی ہے۔ آپ جون اور جولائی ۱۹۴۸ء کا ترجمان القرآن دیکھیئے (کہ اس وقت تک یہی دو عنبر شائع ہوئے ہیں) اس تحریک کے خلاف پورا زہر اگلا ہوا دکھائی دے گا

اور آگے بڑھیئے طلوع اسلام کی اولین اشاعت سے لے کر آج تک، کسی پرچہ کو دیکھیئے اس میں قرآنی نظام حکومت کے قیام کا مطالبہ نہایت شدومد سے کیا جا رہا ہے یہ کسی پر احسان نہیں، طلوع اسلام نے پہلے دن سے یہی مسلک اختیار کیا (کیونکہ یہ اس مسلک کو قرآن کی روشنی میں مسلک حق پرستی سمجھتا تھا) اس نے مسلم لیگ کی تحریک تقسیم ہند کی تائید و اعانت کی تھی تو بھی اسی مسلک کے پیش نظر۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ طلوع اسلام نے اس حقیقت کو بھی نظر انداز نہیں ہونے دیا کہ ان مطالبات میں کوئی حرکت ایسی نہ ہونے پائے جس سے استحکام پاکستان میں کسی قسم کی کمزوری واقع ہو جائے کہ اگر یہ زمین ہی نہ رہی تو قرآنی حکومت کہاں قائم ہو گی لیکن اسکے برعکس یہی مطالبہ "اسلامی جماعت" کی طرف سے پیش ہو رہا ہے لیکن خالص گروہ بندی اور جماعت سازی کے انداز سے جس سے مسلمانوں میں تشتت اور انتشار پیدا ہوا اور یہ اس طرح باہمی جھگڑوں میں الجھیں کہ ان کی ساری قوتیں تخریب میں ضائع ہو جائیں۔

اگر "اسلامی جماعت" اپنے مسلک کی حقانیت پر یقین رکھتی ہے تو ہمارے نزدیک ان کے لئے مستقبل کا لائحہ عمل بالکل واضح ہے۔ ان کا ارشاد ہے:

"دس سال پہلے مسلمانوں کے سامنے یہ سوال آیا تھا کہ وہ ہندو امپریلزم کے تسلط سے اپنے آپ کو کیسے بچائیں۔ اس سوال کا ایک حل یہ پیش کیا گیا کہ اسلام کے اصولوں اور اسلامی سیرت کی طاقت سے اس خطرے کا مقابلہ کیا جائے مگر اس حل نے مسلمانوں کو اپیل نہ کیا اور وہ اسے آزمانے پر آمادہ نہ ہوئے۔ اب یہ

بحث بیکار ہے کہ اسے آزمایا جاتا تو کیا ہوتا۔ دوسرا حل جو پیش کیا گیا تھا وہ یہ تھا کہ قومیت کی بنیاد پر سیاسی جنگ لڑی جائے۔ اس حل کو مسلمانوں نے قبول کیا اور اپنی ساری قومی قوت اپنے تمام ذرائع اور اپنے جملہ معاملات اس قیادت کے حوالے کر دیئے جو ان کے قومی مسئلہ کو حل کرنا چاہتی تھی۔ دس برس کے بعد اس کا پورا کارنامہ ہمارے سامنے ہے اور ہم دیکھ چکے ہیں کہ اس نے کس طرح۔ کس صورت میں ہمارے مسائل کو حل کیا۔ جو کچھ ہو چکا ہے وہ اٹل ہے اب اسے بدلا نہیں جا سکتا اس لیے اس حیثیت سے تو بحث بیکار ہے البتہ اس حیثیت سے اس پر بحث کرنا ضروری ہے۔ کہ جو مسائل اب ہمیں درپیش ہیں کیا ان کے حل کے لئے بھی وہی قیادت موزوں ہے جو ہمارے قومی مسئلہ کو اس طرح حل کر چکی ہے؟ کیا اس کا اب تک کا کارنامہ یہی سفارش کرتا ہے کہ اب جو بڑے بڑے اور نازک مسائل ہمارے سر پر آ پڑے ہیں۔ جن کا بیشتر حصہ خود اسی قیادت کی کارفرمائیوں کے نتیجہ میں پیدا ہوا ہے انہیں حل کرنے کے لئے ہم اس پر اعتماد کریں؟"

(ترجمان القرآن بابت جولائی ۱۹۴۸ء صفحہ ۱۳۸)

یعنی ایک وہ مسئلہ تھا جو آزمایا جا چکا ہے اور جس کے "تباہ کن" نتائج آج قوم کے سامنے ہیں۔ دوسرا مسلک وہ تھا جسے انہوں نے پیش کیا اور قوم نے اسے اختیار نہ کیا۔ ان کا دعویٰ ہے کہ اسے اختیار کر لیا جاتا تو مسلمان بغیر کسی نقصان کے ہندو امپیریلزم کے خطرے سے بچ جاتا۔ بہت اچھا۔ پاکستانی مسلمانوں نے آپ کی نہ سنی اور اس کا خمیازہ بھگت رہے ہیں۔ لیکن مسلمانوں کو ہندوؤں کی امپیریلزم سے بچانے کا سوال تو اب بھی ہمارے سامنے ہے۔ وہ پانچ کروڑ مسلمان "جنہوں نے انتہائی بے کسی کی حالت میں ایک مفتوح اور شکست خوردہ قوم کی حیثیت سے اپنے آپ کو اچانک ان ہندوؤں اور سکھوں کے چنگل میں پایا جن کے ساتھ وہ چند روز پہلے دو بدو لڑ رہے تھے۔

(ترجمان القرآن جولائی ۱۹۴۸ء صفحہ ۱۳۵)

اب ہندو امپیریلزم کے تسلط میں بری طرح جکڑے ہوئے ہیں۔ اگر آپ کے پاس کوئی ایسا پروگرام ہے جس سے وہ امپیریلزم کے چنگل سے چھوٹ سکتے ہیں تو بسم اللہ کیجئے۔ جائیے اور ہندوستان کو اس مسلک کی تجربہ گاہ بنا یئے جسے پاکستان کے مسلمانوں نے ٹھکرا دیا۔ ہندوستان کے مظلوم و مقہور مسلمانوں کی بھی آپ پر ویسی ہی ذمہ داری عائد ہوتی ہے جیسے پاکستان کے مسلمانوں کی۔ بلکہ ان سے بھی کہیں زیادہ۔ آپ کا تجربہ کامیاب ہوگا تو وہاں کے مسلمان تو وہاں کے مسلمان اپنی مصیبتوں سے نجات پا جائیں گے اور پاکستان کے مسلمان آپ کے مسلک کی حقانیت کے خود بخود قائل ہو جائیں گے اور اس قیادت

کو آپ کے قدموں میں ڈال دیں گے جس کی کارفرمائیوں" کے نتائج" وہ اس بُری طرح سے بھگت رہے ہیں۔

(یہ قیادت بھی مسلمانوں کے حق میں کتنی بڑی قیامت بن گئی ہے۔ مبصرین کا خیال ہے کہ اگر ۱۹۲۱ء میں ابوالکلام صاحب آزاد کو "امام الہند" بن لینے دیا جاتا تو وہ کبھی نیشلزم کا وہ فتنہ برپا نہ کرتے جس نے قوم کو اس طرح تباہ برباد کیا۔)

خدا اور رسولؐ کی اطاعت

ستمبر ۱۹۸۴ء کے طلوع اسلام میں محترم پرویز صاحب کا ایک مضمون "خدا اور رسول کی اطاعت" کے عنوان سے شائع ہوا جس میں اطاعتِ رسول کی وضاحت کرتے ہوئے موصوف نے لکھا: یہ سمجھ لیجئے کہ قرآن کریم کی رُو سے:۔

(۱) اطاعت صرف خدا کی ہو سکتی ہے اور کسی کی نہیں۔ اسی کے یہ معنی ہیں کہ حکومت صرف خدا کی ہو سکتی ہے اور کسی کی نہیں۔

(۲) رسول کا پہلا فریضہ یہ ہوتا ہے کہ وہ خدا کے پیغام (یعنی قوانین الٰہیہ) جو اسے بذریعہ وحی ملتا ہے۔ لوگوں تک پہنچائے اسے ابلاغِ رسالت کہتے ہیں۔ اس میں اسے کسی تصرّف یا تبدیلی کا اختیار نہیں ہوتا۔ رسول کا دوسرا فریضہ یہ ہوتا ہے کہ وہ ایسا نظام قائم کرے جس میں خدا کے احکام زندہ فیصلوں کی حیثیت اختیار کریں اور انسانوں کی ہیئت اجتماعیہ اسی نظام کے تابع زندگی بسر کرے (۳/۷) لیکن جب یہ اطاعت ایک حکومت کی شکل اختیار کرے گی تو ظاہر ہے اس کا کوئی نہ کوئی مرکز بھی ہوگا جہاں سے یہ احکام نافذ ہوں گے۔ اور جس کے ذمہ یہ فریضہ ہوگا کہ وہ اس کی نگرانی کرے کہ ان احکام پر عمل درآمد ہو رہا ہے اس مرکزیت (Central - Authority) کا نام منصب امارت یا امامت ہے۔ یہ امیر یا امام وہ ہوگا جو سب سے زیادہ قوانینِ خداوندی کا فرمانبردار ہو اور یہ ظاہر ہے کہ رسول کی موجودگی میں اس سے بڑھ کر قوانینِ خداوندی کا فرمانبردار کون ہوگا؟ اس لیے اس نظام کا اوّلین امیر اور امام خود رسول ہوگا۔ یہ رسول کی دوسری حیثیت ہے یعنی مرکز نظام حکومت الٰہیہ۔ امیرالمؤمنین۔ امام المسلمین۔

قرآن کریم میں بعض آیات ایسی ہیں جن میں اللہ اور رسول کے الفاظ آتے ہیں لیکن ان کے لئے صیغہ واحد استعمال ہوا ہے۔ حالانکہ عربی کے عام قاعدے کے مطابق دو (اللہ اور رسول) کے لئے تثنیہ کا صیغہ آنا چاہیئے مثلاً (۸/۲۰)(۹/۶۲)(۲۴/۴۸-۴۹) موصوف نے قرآن کریم کی متعدد آیات کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا ہے کہ قرآن کریم کی ان نصوص صریحہ سے یہ حقیقت واضح طور پر سامنے آگئی کہ "اللہ اور رسول" کی اطاعت سے مراد مرکز حکومت قرآنی کی اطاعت ہے۔ وہ مرکز جو خدا کے احکام کا نافذ کرنے والا رسولؐ اللہ کی امامت کبریٰ کو

آگے چلانے والا ہوگا۔

مسلمان بادشاہوں نے وہی قوانین رائج کئے جنہیں ہم قانونِ شریعت کہتے ہیں لیکن بایں ہمہ ان کی سلطنتیں نوع انسانی کے لئے کبھی موجب رحمت نہ بن سکیں ان قوانین نے اپنے صحیح اور مکمل نتائج اس وقت پیدا کئے تھے جب یہ دنیا میں محمد رسول اللہ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ کے مقدس ہاتھوں سے نافذ ہوئے تھے۔ اس لئے یہ دیکھنے کے لئے کہ ہمارا نظام وہی نتائج پیدا کر رہا ہے یا نہیں ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ ہماری سیرت، سیرتِ محمدیہ کے قالب میں ڈھل رہی ہے یا نہیں۔ سیرت محمدیہ معراجِ انسانیت ہے اور اس کی اصلی تصویر قرآن کے صفحات میں نقش

اگر باو نہ رسیدی تمام بولہبی است

اکتوبر ۱۹۴۸ء

صفحہ اوّل پر "قائد اعظمؒ کا انتقال" کے عنوان سے محترم اسد ملتانی صاحب کی نظم شائع ہوئی ہے۔ اس ماہ "لمعات" کے عنوان سے وہ سپاسنامہ جو ادارہ طلوع اسلام کی طرف سے محترم پرویز صاحب نے قائد اعظمؒ کو پیش کیا تھا شائع کیا گیا ہے اس کے بعد قائد اعظمؒ کی زندگی پر روشنی ڈالتے ہوئے محترم پرویز صاحب نے شملہ کے ایک واقعہ کا ایک حوالہ دیتے ہوئے لکھا۔ قائد اعظمؒ کی دس سال کی زندگی ہمارے سامنے ہے آپ کوئی ایک بات بھی ایسی پیش نہیں کر سکتے جس سے یہ ظاہر ہو کہ انھوں نے عام مقبولیت (یا پاپولیریٹی) حاصل کرنے کے لئے کچھ بھی کیا ہو (اس کے برعکس) عوام میں ہر دلعزیز بننے کے لئے عام طور پر جن خصوصیات کو ضروری سمجھا گیا ہے ان میں وہ بھی نہ تھیں۔ نہ وضع قطع، نہ تراش خراش، نہ رکھ رکھاؤ۔ حتیٰ کہ خود شاعرانہ تقریر بازی جس کی قوم اس قدر خوگر ہو چکی تھی۔ نہ نصب العین کے مقابلہ میں کسی کے جذبات کی رعائت نہ کسی کی خاطر اصولوں سے ایک قدم بھی انحراف، یہ وہ چیزیں تھیں جن سے اچھے اچھے مقبولِ عام بھی غیر مقبول ہو جاتے ہیں لیکن ایک یہ مرد خودشناس تھا کہ ان تمام موانعات کے باوجود ایسا ہر دلعزیز ہوا کہ اس کی موت پر کروڑوں آنکھوں نے رات کی تنہائیوں میں، جب خدا کے سوا اور کوئی دیکھنے والا نہ تھا چپکے ہی چپکے آنسو بہائے اور ہر قلب نے یہ محسوس کیا کہ اس کا خود اپنا ایک حصہ الگ ہو گیا ہے۔ میرے گھر کا دیا بجھنے سے میرے ہی گھر میں اندھیرا ہوتا ہے۔ پڑوس والے کے ہاں بدستور روشنی رہتی ہے لیکن سورج غروب ہو جانے سے ہر ایک کے گھر میں تاریکی کی چادر بچھ جاتی ہے یہ مقام اسی کو حاصل ہوتا ہے جو اپنی روشنی کو کسی خاص چار دیواری میں محصور نہ رکھے بلکہ ان حدود و قیود سے بلند ہو کر اپنی روشنی کو عام کر دے۔ تاریخ کی رسد گاہوں سے جا کر پوچھئے یہ مقامِ بلند اسی کے حصہ میں آتا ہے جو بغیر کسی ذاتی غرض و غایت کے حق و صداقت کے نصب العین کے حصول میں اپنی زندگی کو وقف کر دے۔۔۔۔۔۔

نظامِ شریعت کی بنیاد

اس ماہ کے طلوعِ اسلام میں محترم پرویز صاحب کا مضمون "نظام شریعت کی بنیاد" کے عنوان سے زینت اوراق بنا ہے جس میں موصوف نے نظامِ شریعت کے نفاذ پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا۔

قرآن آئین و قوانین کی پابندی سکھانے کے لئے آیا ہے وہ خود ضابطۂ آئین حیات ہے جس کی پابندی سکھانے کے لئے آیا ہے وہ خود ضابطۂ آئین حیات ہے جس کی پابندی تمام نوعِ انسان کے لئے ضروری قرار دیتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ وہ ان قوانین و احکام کی پابندی کراتا کسطرح سے ہے۔ قانون کی پابندی کا نام عمل ہے۔ عمل بلاحرکت محال ہے۔ اور حرکت بلاجہت ناممکن۔ حرکت کے لئے جہت (DIRECTION) لاینفک ہے لہٰذا عمل کے لئے جہت کا تعین نہایت ضروری ہے۔ اسی کو منزل یا مقصد کہتے ہیں۔ قرآن نے انسانی زندگی کے لئے ایک منزل (یعنی اس کی حرکت کے لئے ایک جہت) متعین کی ہے۔ اس منزل کی وحدت اور صداقت پر یقین ایمان کہلاتا ہے۔ قرآن، انسانی حرکت و عمل کا مدار تقویٰ کو قرار دیتا ہے۔ جس نظام حیات (دین) میں قوانین کی اتباع اس اصل الاصول پر قائم نہیں۔ نہ ان قوانین کی صحیح اتباع ہی ہوسکے گی اور نہ ہی ان سے کوئی پائیدار نتیجہ ہی مرتب ہوگا۔ اسی بناء پر قرآن کریم نے یہ حقیقت بھی واضح کر دی ہے کہ خود قرآنی احکام کی اتباع بھی اگر رسماً کی جائے اور اس میں "دل کا جھکاؤ" شامل نہ ہو تو وہ اعمال کبھی نتیجہ خیز نہیں ہوسکتے ......

عورت کا فریضۂ زندگی

۲۹ر اگست ۱۹۴۸ء کے ڈان میں ایک تفریحی محفل کی داستان شائع ہوئی جو زنانہ نیشنل گارڈ نے کراچی میں منعقد کرایا تھا۔ اس پر تبصرہ کرتے ہوئے محترم پرویز صاحب نے لکھا:

بنیادی سوال یہ ہے کہ ہمارے معاشرہ میں عورت کا مقام اور اس کا فریضۂ زندگی کیا ہے جب یہ متعین ہوجائے گا تو اس کے بعد یہ سمجھنا آسان ہوجائے گا کہ ہر وہ شے جو اسے اس کے مقام سے گرا دے یا اس کے فریضۂ حیات کی سرانجام دہی میں رکاوٹ پیدا کرے۔ ناروا اور ناواجب ہے۔ دورِ حاضر کے علم والنفس کے ماہرین بالخصوص علم تجزیۂ نفس کے امام مثل فرائیڈ۔ ژنگ اور آڈلر، اپنے عمر بھر کے تجربات و مشاہدات کے بعد جس نتیجہ پر پہنچے ہیں وہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ بچے کو جو کچھ اپنی عمر میں بننا ہوتا ہے وہ آغوشِ مادر ہی میں بن چکتا ہے۔ بچے کے قلب و دماغ کی صحیح تربیت کے لئے اس کی ماں کی گود کے علاوہ کوئی گہوارہ نہیں۔

موصوف نے مغرب کی خواتین کا تجزیہ پیش کرنے کے بعد لکھا کہ ...... یاد رکھئے اسلام جس تہذیب کو آپ کے سامنے رکھتا ہے وہ کوئی ایسی گھناؤنی شے نہیں جس کے تصور سے:

آپ کی روح میں کپکپی پیدا ہو جائے۔ اس تہذیب میں عورت کو اس کا وہ مقام عطا ہوتا ہے جو آج تک اسے کسی دوسری تہذیب نے عطا نہیں کیا اس لئے اپنے یہاں کے گوہر نایاب کو چھوڑ کر، دوسروں کے خزف ریزوں کو سمیٹتے پھرنا کہاں کی دانشمندی ہے ہمیں اگر اپنے مسلمان ہونے پر فخر ہے تو ہمارے سامنے زندگی کا اسوہ (MODEL) بھی انہیں خواتین کا ہونا چاہیئے جو شجر اسلام کے گل سر سبد کی حیثیت رکھتی تھیں۔ اس سیدۃ النساء کا اسوہ جس کی حیات طیبہ یہ تھی کہ ——— آسیا گرداں و لب قراں سرا ———

ہم اس مقام پر اپنی ان محترم خواتین سے خاص طور پر خطاب کرنا چاہتے ہیں جو ہمارے معاشرہ میں آج ممتاز حیثیت رکھتی ہیں یہ محض اللہ کا احسان و انعام ہے کہ اس نے آپکو یہ مقام عطا فرما دیا لیکن اس مقامِ بلند کے جتنے بڑے بڑے مدارج ہیں اتنی ہی اہم اس کی ذمہ داریاں بھی ہیں آپ اس مقام پر ہیں جہاں سے آپکی ہر روش دوسروں پر بھی اثر انداز ہوتی ہے اور وہ آپکی زندگی کو اپنے لئے نمونہ بناتی ہیں۔ فلہذا آپ کے لئے اور بھی ضروری ہے کہ آپ اپنے سامنے وہی نصب العین زندگی رکھیں جو اسلام نے آپ کے لئے متعین کئے ہیں اور آپ کا کوئی قدم اس راہ سے الگ نہ اٹھے جو راہ اس نصب العین کی طرف لے جانے والی ہے۔

مودودی صاحب کا فتویٰ

مودودی صاحب کے کشمیر کی لڑائی کے متعلق فتویٰ صادر کرنے پر متعدد استفسارات کے جواب میں طلوعِ اسلام نے لکھا۔ پچھلے دنوں مودودی صاحب نے جو فتویٰ صادر فرمایا کہ کشمیر کی لڑائی جنگ ہے جہاد نہیں ہے اور مسلمانانِ پاکستان کو اس میں شرکت نہیں کرنی چاہیئے۔ تو اس کے متعلق ہمیں بہت سے استفسارات موصول ہوئے لیکن مودودی صاحب کا فتویٰ کچھ ایسا طفلانہ سا تھا کہ علم اور حقیقت کے اعتبار سے اس پر گفتگو ہی لاحاصل تھی۔ البتہ بعض حضرات نے ہم سے پوچھا ہے کہ بالآخر مودودی صاحب کا اس سے مقصد کیا تھا! ہم اس باب میں اتنا عرض کرنا کافی سمجھتے ہیں کہ جہاد کے خلاف اس قسم کے فتاویٰ کوئی نئی چیز نہیں۔ جب اور جہاں کہیں مسلمانوں کے اندر کسی حرکت کے آثار پیدا ہوئے اور ان سے دشمنانِ اسلام کو خطرات لاحق ہوئے تو لوگوں کے دلوں میں وسوسہ انگیزی کے لئے اس قسم کے فتاویٰ منصۂ شہود پر آگئے۔ حضرت سید احمد شہید بریلویؒ کی تحریکِ جہاد کسی تعارف کی محتاج نہیں ..... جب یہ تحریک ترقیوں کے زینے پر چڑھتی جا رہی تھی اور کیفیت یہ تھی کہ سرحد سے سکھوں کی حکومت ختم ہو چکی تھی اور اس کی جگہ مسلمانوں کا پرچم فضائی پہنائیوں میں لہرا رہا تھا۔ اور انگریز اور سکھ دونوں اس کی رفتار سے بدحواس ہو رہے تھے تو اس وقت یہی تیر تھا جس نے مجاہدین کے سینوں کو وساوس انگیزی سے چھلنی کر دیا تھا...... اس مقام پر "سیرتِ

"سید احمد شہید" کے مصنف کے چند اقتباسات بطور حوالہ درج کرتے ہوئے ادارہ نے لکھا ہے۔

چنانچہ حضرات "علماء کرام" کی اس مجاہدانہ "تگ و تاز" کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگوں میں بددلی سی پھیل گئی جس طرح مودودی صاحب کے فتویٰ سے مجاہدینِ کشمیر میں سے بعض سادہ لوح لوگ متاثر ہو گئے اور اس طرح وہ تحریک، جو ہندوستان میں مسلمانوں کی نشاۃِ ثانیہ کی ضامن بننے والی تھی ان "مقدسین" کے فتاویٰ کی نظر ہو گئی۔

اس تحریک کے بقیتہ السیف مجاہدین کے سینوں میں ایمان کی جو حرارتیں موجود تھیں وہ انگریزی حکومت کے لئے بڑی خطرناک سمجھی جاتی تھیں۔ ان چنگاریوں کو دبانے کیلئے پھر "مذہب" ہی کو آگے بڑھایا گیا اور قادیان کے "بابِ نبوت" سے یہ فتویٰ صادر ہو گیا کہ "ایسے دوستو جہاد کا اب چھوڑ دو خیال"

کشمیر کا مسئلہ پاکستان کے لئے موت و حیات کا مسئلہ ہے چونکہ مودودی صاحب شروع سے پاکستان کے خلاف چلے آ رہے ہیں اس لئے وہ کسطرح برداشت کر سکتے تھے کہ کشمیر، پاکستانی مسلمانوں کے لئے وجہِ تقویت بن جائے۔ اس لئے ان کے فتویٰ کا مفہوم ظاہر ہے۔ غیر مسلم عناصر پاکستان کی تخریب میں ایک متحدہ محاذ بنائے جا رہے ہیں اور "مقدسین" کا یہ طائفہ پاکستان کے اندر بیٹھا اس قسم کے فتنے پھیلا رہا ہے۔

ہوس فتویٰ بازی کی تو ان کی یہ کیفیت۔ لیکن کیریکٹر کا یہ عالم کہ اس فتویٰ کے خلاف ذرا سی تحریک ہوئی اور یہ لگے بغلیں جھانکنے۔ کہیں اس فتویٰ کی تاویلیں ہو رہی ہیں۔ کہیں توجیہات بیان کی جا رہی ہیں۔ پھر اس سے رجعت اختیار کر لی جاتی ہے اور "پاکستان کے فدائی" بن کر خود اس "جہاد" میں شرکت کے ارادے ظاہر کئے جاتے ہیں۔

اور پھر اپنی علمی بصیرت پر اعتماد کی یہ کیفیت کہ علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی کو لکھتے ہیں کہ اگرچہ میں آپ کے دلائل سے مطمئن نہیں ہوا لیکن اگر آپ یہ لکھ دیں کہ آپ اپنی کامل بصیرت کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ کشمیر کی جنگ جہاد ہے تو میں اپنے خیالات سے رجوع کر لوں گا۔ لیکن جب علامہ صاحب لکھ دیتے ہیں کہ میں اپنی کامل بصیرت کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا ہوں تو پھر مودودی صاحب عزّہ کر جاتے ہیں اور کوئی جواب ہی نہیں دیتے۔

واشربوا فی قلوبهم العجل (بچھڑے کی محبت ان کے دل کی گہرائیوں میں گھر چکی تھی) کے عنوان سے طلوعِ اسلام نے اپنی ماہ اکتوبر ۱۹۴۸ء کی اشاعت میں لکھا ہے۔

"کچھ عرصہ سے اربابِ حکومت، دشمنانِ پاکستان کا یہ تکرار ذکر کرتے چلے آ رہے ہیں۔

ہم نے بارہا اس پر اپنے ذکر کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے مطالبہ کیا ہے کہ ایسے دشمنانِ ملک و حکومت اور انکی تخریبی سرگرمیوں کو پوری طرح بے نقاب کرنا چاہیئے تاکہ جمہور ان کے دام تزویر سے آگاہ ہو کر بچ سکیں، نیز اعدائے وطن کے خلاف فوری اور ہمہ گیر تعزیری کارروائی کرنی چاہیئے۔ یہ کہنا کہ پاکستان میں تخریبی عناصر موجود ہیں ایک مسلمہ حقیقت کو دہرانا ہے۔ یہ امر بھی مخفی نہیں کہ ان عناصر تخریب کا مرکز اور سرچشمۂ ہدایت کونسا ہے۔ ففتھ کالم وہ مرضِ دق ہے جو مریض ملک کو اندر سے دیمک کی طرح چاٹ جاتا ہے۔ بین الاقوامی سیاست میں سلطنتوں کو الٹنے اور "اندرونی" انقلاب برپا کرنے کا یہ بدترین حربہ ہے۔ اس زہر کا ہمارے جسدِ حیات میں سرایت کر جانا اور رگوں میں پھرنا ہلاکت اور موت کا پیش خیمہ ہے۔ پاکستان جن اہم مسائل و مشکلات سے دوچار ہے وہ اظہر من الشمس ہیں۔ ہر حکومت کے لئے بالعموم اور پاکستان جیسی نوزائیدہ سلطنت کے لئے بالخصوص داخلی امن کی اشد ضرورت ہے ہم نے جب اربابِ حکومت سے پوری قوت سے عملی قانونی کارروائی کرنے کا مطالبہ کیا تھا تو ہمیں ڈر تھا کہ اس عظیم الشان خطرہ کا کما حقہٗ احساس نہیں کیا گیا۔ ہمارے اس ڈر کو اس حیران کن اور بظاہر ناقابلِ یقین خبر نے تقویت دے دی ہے کہ سندھ کے وزیر اعظم پیر الٰہی بخش صاحب کا پرسنل اسسٹنٹ پرسرام جس کے سپرد حکومت کی خفیہ دستاویزات کی پیروی ونگرانی تھی۔ ہندوستان بھاگتے ہوئے گرفتار کر لیا گیا ہے اور اس کے قبضہ سے حکومت کی خفیہ دستاویزات برآمد ہوئی ہیں۔ یہ دستاویزات نامہ نگار ڈان کی اطلاع کے مطابق۔ ٹرکوں موٹر کاروں، جیپوں۔ پلوں اور دیگر اہم مقامات سے متعلق تھیں جنہیں صوبہ سندھ میں خصوصی اہمیت حاصل ہے ....."

نومبر 1948 یہ رسالہ اسی صفحات پر مشتمل ہے اس ماہ کے لمعات میں "نظام شریعت" کے متعلق اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا گیا ہے" دنیا میں بعض مصیبتیں انسان پر ہنگامی حوادث کی وجہ سے آتی ہیں جن پر اسے قدرت نہیں ہوتی۔ اس لئے اُسے بسا اوقات ان کے نتائج و عواقب کو مجبوراً برداشت کرنا پڑتا ہے کہ اس کے سوا چارہ کار نہیں ہوتا۔ لیکن اکثر مصیبتیں ایسی ہوتی ہیں جنہیں انسان اپنے لئے آپ پیدا کر لیتا ہے اور اس طرح خواہ مخواہ اپنی خودساختہ پریشانیوں میں مبتلا رہتا ہے۔ تشکیلِ پاکستان کے بعد، جو مصائب و نوازل اس کے دشمنوں کے مشؤمہ عزائم کے پیدا کردہ تھے یا جو حوادثِ ارضی و سماوی کے ہاتھوں رُونما ہوئے، وہ بھی کچھ کم نہ تھے لیکن ان سے کہیں زیادہ مہیب و شدید ہماری خودساختہ مشکلات ہیں جن میں ہم اس بری طرح سے گھرے ہیں کہ ان سے نجات کی کوئی صورت دکھائی نہیں دیتی ان خودساختہ مصائب میں سے سب سے بڑا "ہوّا" وہ ہے جو نظامِ شریعت، کی شکل میں اعصاب ملت پر سوار ہے اور جس سے کوئی راہِ مفر نظر نہیں آتی۔ ایک مسلمان

کے لئے یہ سوال ہی مضحکہ خیز ہے کہ وہ شریعت کے نظام پر چلنا چاہتا ہے یا غیر شرعی آئین کے تابع۔ انگریز کی غلامی میں دیوانی مقدمات میں فریقین میں سے جب کوئی یہ کہتا کہ میں اپنا فیصلہ شریعت کے مطابق نہیں بلکہ رواج کی رُو سے چاہتا ہوں تو سینہ میں دل اور دل میں ایمان کی رمق رکھنے والے طبقہ میں اس کی یہ حرکت سخت مذموم قرار پاتی۔ اس وقت عام طور پر کہا جاتا تھا کہ جن معاملات میں ہمیں اختیار نہیں ان میں تو خیر بے بسی ہے لیکن جن صورتوں میں فیصلہ ہمارے اختیار میں چھوڑا جاتا ہے ان میں رواج کو شریعت پر ترجیح دینا ______ اپنے کلمۂ شہادت کی عملی تکذیب ہے چنانچہ مسلمانوں کی تحریکِ آزادی سے مقصود یہی یہ تھا کہ جن امور میں انہیں اختیار حاصل نہیں تھا کہ وہ شریعت کے مطابق اپنے معاملات کے فیصلے کرا سکیں، ان امور میں بھی انہیں یہ اختیار مل جائے حتیٰ یکون الدین کلہ اللہ۔ چنانچہ یہ اختیار حصولِ پاکستان کے بعد ملے گا۔ فالحمد للہ علیٰ ذالک۔

اس کے بعد یہ سوال ہی پیدا نہیں ہونا چاہیئے تھا کہ پاکستان کا نظامِ حکومت کیا ہونا چاہیئے یہی وہ حقیقت تھی کہ جس کی طرف قلبِ ملت۔ محترم قائداعظمؒ نے ۲۵ جنوری ۱۹۴۸ء کو کراچی کے ایک اجتماع میں ان الفاظ میں ارشاد فرمایا تھا کہ۔

"میں تو یہ سمجھ ہی نہیں سکا کہ لوگوں کو اس استفسار کی ضرورت کیوں پڑ رہی ہے کہ پاکستان کا آئین اسلامی ہوگا یا نہیں ...... اسلامی اصول تو ایسے ہیں جنکی نظیر دنیا میں کوئی بھی پیش نہیں کر سکتا یہ اصول آج بھی اسی طرح کارآمد ہیں جس طرح آج سے تیرہ سو سال پیشتر تھے۔ (ڈان ۲۶/۱)

اسی حقیقت کو محترم لیاقت علی خان نے پشاور کے ایک اجتماع کے سامنے ان الفاظ میں پیش کیا تھا۔

"ہم نے پاکستان کا مطالبہ ایک قطعۂ ارض حاصل کرنے کے لئے نہیں کیا تھا بلکہ ہم ایک ایسی تجربہ گاہ حاصل کرنا چاہتے تھے جہاں ہم اسلام کے اصولوں کو آزما سکیں ..... پاکستان صحیح معنوں میں ایک اسلامی اسٹیٹ ہوگی جس میں عدل و انصاف اور مساوات کے اسلامی اصولوں کا نفاذ ہوگا اور طبقاتی امتیاز ختم کر دیا جائے گا پاکستان ہماری ایک تجربہ گاہ ہوگی اور ہم دنیا کو دکھا سکیں گے کہ تیرہ سو سال پہلے کے اصول آج بھی کارآمد ہو سکتے ہیں"۔ (ڈان ۱۴/۱۱، ۱۵ جنوری ۱۹۴۸ء)

کرنے کا کام یہ تھا کہ اس اصول کو پاکستان کی مجلسِ آئین ساز کی وساطت سے ایک آئینی منشور کی شکل دے کر یہ اعلان کر دیا جاتا کہ چونکہ پاکستان ایک اسلامی سٹیٹ ہے اسلئے اس کا نظامِ حکومت بھی لا محالہ اسلامی ہوگا اور اس کے بعد اس نظام کی تدوین و ترتیب کے لئے عملی قدم اٹھایا جاتا۔ لیکن ہمارے اربابِ بست وکشاد نے ایسا نہ کیا اور اس طرح

اپنے ہاتھوں ایک ایسی مصیبت پیدا کر لی جس سے اس قسم کی الجھنیں پیدا ہو گئیں اور ہو رہی ہیں کہ جوں جوں انہیں سلجھانے کی کوشش کی جاتی ہے وہ پیچیدہ تر ہوتی جاتی ہیں۔ سب سے بڑی الجھن یہ کہ اس سے ان تخریبی عناصر کے لئے جو شروع ہی سے پاکستان کے خلاف چلے آتے تھے اور تشکیلِ پاکستان کے بعد اس کی تخریب کے منحوس ارادے مقدس نقابوں میں چھپائے ہوئے تھے، عوام کے دلوں میں ظنون و وساوس پیدا کرنے کا موقعہ بہم پہنچا دیا اور انہوں نے اس طرح امید اور یقین کی ان مستحکم بنیادوں کو جن پر اس "اسلامی تجربہ گاہ" کا قصرِ مشید و رفیع المنزلت استوار ہوتا تھا، شکوک و تذبذب، بدظنی اور بداعتمادی اور یاس و ناامیدی کے مہلک جراثیم سے متزلزل کر دیا اس سے پاکستان کو ایسا دوررس اور مہلک نقصان پہنچا ہے جس کا سطحی نگاہوں سے اندازہ لگانا مشکل ہے۔

عالمِ اسلامی میں حج کی اہمیت

ریڈیو پاکستان کراچی سے یوم الحج کی شام محترم پرویز صاحب کی ایک تقریر نشر ہوئی جس میں موصوف نے حج کی اہمیت بیان کرتے ہوئے فرمایا:۔

حج سے مفہوم یہ ہے کہ تمام دنیا کے انسان، بلا تفریقِ رنگ ونسل اور بلا امتیازِ وطن، زبان، جو اس نصب العین پر ایمان رکھتے ہوں کہ دنیا میں کسی انسان کو کسی دوسرے انسان پر حکومت کرنے کا حق حاصل نہیں ہے، محکومیت صرف خدا کے قانون کی جائز ہے جو فطرتِ انسانی کا ترجمان ہے، اپنے اپنے نمائندے چنیں۔ یہ نمائندے اپنے میں سے ایک منتخب کردہ امیر کی زیر قیادت، مرکزِ وحدتِ انسانیت یعنی کعبتہ اللہ کی طرف روانہ ہوں۔ عرفات کے میدان میں ان تمام نمائندگان کا باہمی تعارف ہو۔ پھر یہ تمام امرائے ملت، اپنے میں سے ایک امیرالامراء کا انتخاب کرلیں اور مختلف ممالک کے احوال و ظروف کو سامنے رکھ کر، باہمی مشاورت سے ایک ایسا پروگرام مرتب کرلیں جو آئندہ سال کے لئے اصولی طور پر بطور مشترکہ پالیسی اختیار کیا جائے اور جو امن و سلامتیٔ انسانیت کا ضامن اور فلاح وسعادت وآدمیت کا کفیل ہو۔ ان کا انتخاب کردہ امام اپنے خطبۂ حج میں اس پروگرام کا اعلان کر دے جو دنیا کے گوشے گوشے تک پہنچ جائے۔ اس کے بعد یہ تمام نمائندگان مقام منیٰ میں جمع ہو کر اس اصولی پروگرام کی تفصیلات وجزئیات پر غور کریں اور یہ سوچیں کہ ایک دوسرے ملک پر اس کا عملی اثر اور ردِ عمل کیا ہوگا۔ وہاں باہمی مذاکرات بھی ہوں اور دعوتیں اور ضیافتیں بھی جس کے لئے قربانی تجویز کی گئی ہے اس کے بعد یہ نمائندگان اپنے اپنے ملکوں میں واپس آجائیں اور اس طے شدہ پروگرام کے مطابق اپنے اپنے لوگوں کو چلائیں۔ یہ ہے وہ عملی طریقہ جو قرآنِ کریم نے تمام نوعِ انسانی

کو ایک امت واحدہ بنانے اور ان کے تمدنی مسائل کا حل تجویز کرنے کے لئے بتایا ہے قرآن کریم نے حج کے اس مقصد اور غایت کو دو مقامات پر بیان کیا ہے۔ آپ اس مختصر ٹکڑوں کی جامعیت پر غور کیجئے اور پھر سوچئے کہ کسی اجتماع کی غایت اس سے بلند اور کوئی انداز بیان اس سے زیادہ بلیغ بھی ہو سکتا ہے؟ ایک جگہ ارشاد ہے کہ حج کے اجتماع سے مقصود یہ ہے۔ لیشھدوا منافع لھم ۔ تاکہ وہ لوگ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں کہ اس میں ان کے لئے کسقدر فائدے ہیں اور اس کی غایت؟ قیاماً للناس یعنی اس سے دنیا میں انسانیت قائم رہے۔

غلام اور لونڈیاں ماہ نومبر ۱۹۴۸ء کے طلوع اسلام میں باب المراسلات کے عنوان میں ایک صاحب دریافت فرماتے ہیں:۔

میں نے ذیل کا خط محترم سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کی خدمت میں بھیجا تھا میں آپ کے اس مطالبہ سے متفق ہوں کہ پاکستان میں شریعت کا نفاذ نافذ ہونا چاہیئے۔ اس باب میں دو ایک باتیں دریافت طلب ہیں جن کی وضاحت کے لئے عریضہ ارسال خدمت ہے امید ہے کہ آپ جواب سے سرفراز فرمائیں گے

۱۔ سوال یہ ہے کہ کیا نظام شریعت میں جنگ کے قیدیوں کو غلام اور لونڈیاں بنانے کی اجازت ہوگی؟ کیا ان غلام اور لونڈیوں کو فروخت کرنے کا بھی حق حاصل ہوگا؟ کیا ان لونڈیوں سے بیویوں کے علاوہ تمتع جائز ہوگا۔ اور اس پر تعداد کی تو کوئی قید نہیں

۲۔ کیا اس نظام شریعت میں لونڈی و غلام کی خرید و فروخت (علاوہ ان لونڈی و غلام کے جو جنگی قیدی ہوں) ابھی پاکستان کے اندر جائز ہوگی جس طرح آجکل حجاز میں بردہ فروشی ہوتی ہے۔

اس کے جواب میں مودودی صاحب کی طرف سے ذیل کا گرامی نامہ موصول ہوا ہے۔

مکرمی و محترمی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ! آپ کا عنایت نامہ ملا جو سوالات آپ نے کئے ہیں ان کا مختصر جواب تو ہاں اور نہیں کی شکل میں دیا جا سکتا ہے۔ لیکن اس سے آپ کی تسکین نہیں ہوگی اس لئے ذرا تفصیل کے ساتھ آپ کو جواب دیتا ہوں۔

نظام شریعت میں جنگی قیدیوں کو لونڈی غلام بنانے کی اجازت ایسی صورت میں دی گئی جب کہ وہ قوم جس سے ہماری جنگ ہوئی ہو نہ تو قیدیوں کے تبادلے پر راضی ہے، نہ فدیہ یکمشت قیدی چھوڑے اور نہ فدیہ دے کر اپنے قیدی چھڑائے۔

آپ غور کریں تو سمجھ سکتے ہیں کہ اس صورت میں جو قیدی کسی حکومت کے پاس

رہ جائیں وہ یا تو انہیں قتل کرے گی یا انہیں عمر بھر اس قسم کی "انسانی باڑوں" میں رکھے گی جنہیں آج کل ____ (CONCENTRATION CAMP) کہا جاتا ہے اور کسی قسم کے "انسانی حقوق" دیئے بغیر ان سے جبری محنت لیتی رہے گی۔ ظاہر ہے کہ یہ صورت زیادہ بے رحمانہ بھی ہے اور خود اس ملک کے لئے بھی زیادہ مفید نہیں ہے۔ جس میں اس قسم کے قیدیوں کی ایک بڑی تعداد ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ایک خارجی عنصر کی حیثیت سے موجود رہے۔ اسلام نے ایسے حالات کے لئے جو شکل اختیار کی ہے وہ یہ ہے کہ ان قیدیوں کو فرداً فرداً مسلمانوں میں تقسیم کر دیا جائے اور ان کی ایک قانونی حیثیت مشخص کر دی جائے۔ اسی طرح جو انفرادی رابطہ ایک ایک شخص کا ایک مسلم خاندان سے پیدا ہوگا اس میں اس کا امکان زیادہ ہے کہ ان سے انسانیت اور شرافت کا برتاؤ ہو۔ اور ان کا ایک اچھا خاصہ حصہ بتدریج مسلمانوں کی سوسائٹی میں جذب ہو جائے۔

جن مسلمانوں کو ایسے اسیرانِ جنگ پر حقوق ملکیت حاصل ہوتے ہیں، ان کے لئے شریعت نے یہ ضابطہ مقرر کیا ہے کہ اگر کوئی لونڈی یا غلام ان سے درخواست کرے کہ میں محنت مزدوری کرکے اپنے فدیہ کی رقم فراہم کرنا چاہتا ہوں تو وہ اس کی درخواست کو رد کرنے کا حق نہیں رکھتا۔ انہیں ازروئے قانون ایک خاص مدت تک کے لئے اس کو مہلت دینی ہوگی اور اس مدت میں اگر وہ اپنی رقم ادا کر دے تو اسے آزاد کر دینا پڑے گا۔ اس قسم کی لونڈیوں اور غلاموں کو بیچنے کی اجازت دراصل اس معنی میں ہے کہ ایک شخص کو ان سے فدیہ وصول کرنے اور فدیہ وصول نہ ہونے تک اس سے خدمت لینے کا جو حق حاصل ہے اس کو وہ معاوضہ لے کر دوسرے شخص تک منتقل کر دیتا ہے۔ یہ قانون میں گنجائش جس مصلحت سے رکھی گئی ہے اس کو آپ پوری طرح سے اسی صورت میں سمجھ سکتے ہیں جب کہ کسی دشمن فوج کے سپاہی کو بطور قیدی رکھنے کا اتفاق ہو۔ فوجی سپاہیوں سے خدمت لینا کوئی آسان کام نہیں ہے اور اسی طرح دشمن قوم کی کسی عورت کو گھر میں رکھنا کوئی کھیل نہیں ہے۔ اگر کسی شخص کے لئے یہ گنجائش نہ چھوڑی جاتی کہ جس قیدی مرد یا عورت سے وہ عہدہ برآ نہ ہو سکے، اس کے حقوقِ ملکیت دوسرے کی طرف منتقل کر دے تو یہ لوگ بلائے جان بن جاتے۔

جنگ میں گرفتار ہونے والی عورتوں کے لئے (جب کہ نہ ان کا تبادلہ ہو اور نہ فدیہ کا معاملہ طے ہو سکے) اس سے بہتر حل اور کیا ہو سکتا ہے کہ جس شخص کی ملکیت میں وہ دی جائیں اس کو ان کے ساتھ جنسی تعلق قائم کرنے کا قانونی حق دے دیا جائے۔ اگر ایسا نہ کیا جاتا تو یہ عورتیں ملک میں بداخلاقی پھیلنے کا ایک مستقل ذریعہ بن جاتیں۔ قانونی حیثیت سے "ملک یمین" اور عقدِ نکاح میں کوئی خاص فرق نہیں ہے بلکہ "ملک یمین" تو باقاعدہ حکومت کے توسط سے حاصل ہوتی ہے۔ جو عورت کسی کے ملک یمین میں دی جائے اس کے ساتھ کسی دوسرے شخص کا جنسی تعلق جائز نہیں ہے۔

جو اولاد اس سے ہوگی اس کا نسب اصل مالک ہی سے ثابت ہوگا اور وہ اپنے باپ کی اسی طرح جائز وارث ہوگی جس طرح کی آزاد بیوی کی اولاد۔ جس لونڈی کی اولاد ہو جاتی اسے بیچنے کا مالک کو حق حاصل نہیں رہتا اور مالک کے مرنے کے بعد وہ عورت خود بخود آزاد ہو جاتی ہے۔

لونڈیوں سے تمتع کے لئے تعداد کی قید اس لئے نہیں لگائی گئی کہ ان عورتوں کی تعداد کا کوئی تعین ممکن نہیں ہے جو کسی جنگ میں گرفتار ہو کر آسکتی ہیں۔ بالفرض اگر ایسی عورتوں کی بہت بڑی تعداد جمع ہو جائے تو سوسائٹی میں انہیں کھپانے کی کیا تدبیر ہو سکتی ہے۔ اگر لونڈیوں سے تمتع کے لئے تعداد کا تعین پہلے ہی کر دیا ہو۔ لیکن بعد کے ادوار میں امراء اور رؤسا نے اس قانونی گنجائش کو جس طرح عیاشی کا حیلہ بنا دیا۔ وہ ظاہر ہے کہ شریعت کے منشاء کے بالکل خلاف ہے۔ کوئی رئیس اگر عیاشی کرنا چاہے اور قانون کے منشاء کے خلاف قانون کی گنجائشوں سے فائدہ اٹھانے پر اتر آئے تو نکاح کا ضابطہ ہی کب اس کے لئے رکاوٹ بن سکتا ہے وہ روز ایک نئی عورت سے نکاح کر سکتا ہے اور دوسرے دن اسے طلاق دے سکتا ہے۔

حجاز میں جو بردہ فروشی آج کل ہوتی ہے اس کی تفصیل مجھے نہیں معلوم۔ لیکن اصولی طور پر یہ عرض کر سکتا ہوں کہ جنگ کے سوا کسی دوسرے طریقے سے آزاد آدمیوں کو پکڑنا اور ان کی خرید و فروخت کرنا شریعت میں حرام ہے۔ والسلام

(بقلم ابوصالح اصلاحی بحکم حضرت مولانا ابوالاعلیٰ مودودی صاحب)

محترم مودودی صاحب نے میرے استفسارات کا جواب نفی یا اثبات میں نہیں دیا۔ لیکن ان کے خط سے ظاہر ہے کہ ان کے نزدیک اسلام میں جنگ کے قیدیوں کو غلام اور لونڈیاں بنانے کی اجازت ہے۔ ان غلاموں اور لونڈیوں کو فروخت بھی کیا جا سکتا ہے ان لونڈیوں سے تمتع بھی جائز ہوگا اور اس پر تعداد کی کوئی قید نہیں ہوگی۔

اس کی تائید میں انہوں نے جو دلائل بیان فرمائے ہیں کم از کم میں تو ان سے مطمئن نہیں ہوا۔ میرا تو اس تصور سے دل کانپتا ہے کہ اسلام جو دنیا سے غلامی مٹانے کا مدعی ہے وہ خود انسانوں کو غلام اور لونڈیاں بنانے کی اجازت دیتا ہو۔ لیکن چونکہ یہ معاملہ مذہب سے تعلق رکھتا ہے اس لئے گذارش ہے کہ براہ کرم مطلع فرمائیں کہ کیا میں مودودی صاحب کے خط سے جس نتیجہ پر پہنچا ہوں وہ درست ہے اور کیا اسلام کی یہی تعلیم ہے؟ جواب خواہ براہ راست مجھے تحریر فرمائیں خواہ طلوع اسلام میں درج فرما دیں۔

طلوعِ اسلام ہمارے بھائی نے مودودی صاحب کے خط سے جو نتیجہ اخذ کیا ہے وہ بالکل درست ہے، وہ اس کے قائل ہیں کہ اسلام میں اسیرانِ جنگ کو غلام اور ان کی عورتوں کو لونڈیاں بنایا جا سکتا ہے۔ ان غلاموں اور لونڈیوں کو فروخت بھی کیا جا سکتا ہے اور ان لونڈیوں سے، بلا قید نکاح و تعداد، جنسی تعلقات بھی پیدا کئے جا سکتے ہیں۔ باقی رہے

ان کے دلائل تو وہ یقیناً ارسطو کے ان دلائل سے زیادہ دقیع اور قوی نہیں ہیں جو وہ نفسِ غلامی کے جواز بلکہ وجوب میں دیا کرتا تھا۔ کہتے ہیں کہ اس کے پاس ستّر غلام تھے اور وہ غلام کے وجوب میں اتنے ہی دلائل رکھتا تھا۔ جنہیں ناقابلِ تردید سمجھا جاتا تھا لیکن یونان کو ارسطو کے دلائل لے ڈوبے اور اسلام کو مودودی صاحب جیسے فقہا کی منطق ؎

حذر اے چیرہ دستاں! سخت ہیں فطرت کی تعزیریں

ہمیں اس اضطراب کی علّت بھی معلوم ہے جس کی وجہ سے مودودی صاحب کو اس سیدھے سادے جواب کے لئے دلائل و مصالح کے سہارے تلاش کرنے پڑے، خواہ وہ دلائل و مصالح خود سہاروں کے محتاج ہی کیوں نہ ہوں اور وہ علّت یہ ہے کہ ایک طرف ان کا دامن روایات کی خاردار جھاڑیوں سے الجھا رہتا ہے اور دوسری طرف وہ "ماڈرن" بھی بننا چاہتے ہیں لہٰذا کشمکش لازمی ہے ؎

ایماں مجھے روکے ہے تو کھینچے ہے مجھے کفر کعبہ میرے پیچھے ہے کلیسا میرے آگے

طلوعِ اسلام خدا کے عطا فرمودہ دین کو ہی دین سمجھتا ہے جو فطرتِ انسانی کا صحیح ترجمان ہونے کی وجہ سے قدامت و جدّت کی کشمکشوں سے بلند ہے۔ وہ جس قدر فراست بھی حاصل کر سکنے کی استطاعت ... رکھتا ہے خدا کی کتابِ منیر سے حاصل کرتا ہے اس لئے اسے ان امور میں کبھی الجھاؤ پیدا نہیں ہوگا ؎

قلندر جز دو حرف لا الٰہ کچھ بھی نہیں رکھتا
فقیہہ شہر قاروں ہے لُغت ہائے حجازی کا

قرآن میں اسیرانِ جنگ کے متعلق سورۂ محمدؐ کی ایک ہی آیت میں حکم ہے اور اس آیت کے چار لفظوں نے معاملہ کو صاف کر کے رکھ دیا ہے۔ اس نے کہا ہے کہ جنگ میں جو قیدی تمہارے ہاتھ آئیں۔

فَاِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَاِمَّا فِدَآءً

انہیں فدیہ لے کر چھوڑ دو یا احسان رکھ کر

اللہ اللہ خیر سلّا۔ باقی رہی وہ مدّت جس میں وہ بطور قیدی تمہارے پاس رہیں تو ظاہر ہے کہ وہ انسان ہیں اور ان سے انسانوں جیسا سلوک روا رکھا جائے گا کسی سے انسانیت سے گرا ہوا سلوک، خود مسلمان کے شعار اور حسنِ فطرت کے خلاف ہے جو خدا پر ایمان، مسلمان کے اندر اجاگر کرتا ہے۔ کسی انسان پر دوسرے انسان کا "حقِ ملکیت" یکسر غیر فطری ہے، اسلام جو شرفِ انسانیت اور احترامِ آدمیت کی تعلیم دینے کے لئے آیا تھا اس کا مقام اس سے کہیں بلند ہے کہ وہ ایک انسان کو دوسرے انسان کی ملکیّت میں دے دینے کی اجازت دے دے اور اس کے لئے راہیں کشادہ کر دے۔ غلامی اسی کو کہتے ہیں اور اسلام کا

دامنِ تقدس ان اتہامات سے یکسر پاک ہے جو اس کے دشمنوں نے وضعی روایات کے راستے اس پر لگائے اور جو شومئ قسمت سے ہمارا دین بن چکے ہیں۔ سبحان اللہ تعالیٰ عما یصفون۔

قرآن کریم میں ملک یمین (غلاموں اور لونڈیوں) کے متعلق جس قدر احکام ہیں وہ ان غلاموں اور لونڈیوں سے متعلق ہیں جو اس وقت عربوں کے ہاں موجود تھے اور جنہیں آہستہ آہستہ ان احکامات کی رُو سے جزو سوسائٹی بنایا جا سکتا تھا اس نے انہیں اس طرح بتدریج معاشرۂ اسلامی میں جذب کیا اور آئندہ کے لئے غلامی کے دروازے اس حکم کی رُو سے بند کر دیئے جس کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ لیکن مسلمانوں کی ملوکیت نے ان دروازوں کو ایک ایک کرکے پھر سے کھول لیا۔ اور قیامت بالائے قیامت، کہ اس ننگِ انسانیت مسلک کو وضعی روایات کی رُو سے، منسوب کر دیا اس ذات اقدس واعظم کی طرف جس کے ظہور کا مقصد ہی قرآن نے یہ بتایا تھا کہ وہ ان اغلال وسلاسل کو توڑنے کے لئے آیا ہے جس میں انسانیت جکڑی ہوئی آ رہی تھی۔ وَیضع عنھم اصرھم والاغلال التی کانت علیھم

پاکستانی افسر اس عنوان کے تحت پاکستانی افسران کے عوام کے ساتھ رویہ پر طلوع اسلام نے لکھا.... کہ جب ہم اپنی حالت کا جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں اس تبدیلی کے کوئی آثار نظر نہیں آتے جو ایک آزاد قوم کی حیثیت سے ہمارے اندر پیدا ہونی چاہیئے تھی، عوام کا تو ذکر ہی کیا کہ وہ کالانعام مشہور ہیں۔ خواص کی ذہنیتیں بھی اس عظیم انقلاب کے اثرات سے بیگانہ نظر آتی ہیں جس نے ہمیں دو صدیوں کی محکومی سے نکال کر آزاد اقوام کی صف میں لا کھڑا کیا۔ عوام میں تحریکِ پاکستان کی فوری اور ہمہ گیر مقبولیت کا سبب وہ مجلسی خرابیاں تھیں جو بیرونی حکومت کے پیش کردہ نظام سے پیدا ہو چکی تھیں۔ عوام نے ان خوش آئند توقعات کے ساتھ پاکستان کا خیر مقدم کیا کہ اپنی حکومت ان ناگوار مجلسی خرابیوں کو دُور کر دے گی۔ لیکن عوام کو اس سلسلہ میں بڑی طرح ناکام ہونا پڑا۔

اربابِ اقتدار کی "دورباشی" نے ابھی تک عوام کو یہ محسوس نہیں ہونے دیا کہ ملک کی عنانِ اختیار فی الواقعہ اپنوں کے ہاتھ میں آگئی ہے۔ عوام اور کارپردازانِ حکومت میں ربطِ باہمی کے سلسلہ میں ممکن ہے۔ عذر پیش کئے جا سکیں لیکن قیامت یہ ہے کہ خود حکومت کی مشینری کے مختلف پرزوں میں یہ باہمی ربط مفقود ہے ماتحت وافسر کا امتیاز پہلے سے کہیں زیادہ ہے۔ محترم وزیراعظم پاکستان کے ان پے در پے اعلانات کے باوجود کہ افسران، قوم کے خادم ہیں ان افسران کی شانِ حاکمیت میں کوئی فرق نہیں آیا۔ ان کی سیرت میں بدلے ہوئے حالات نے کوئی تبدیلی پیدا نہیں کی۔ کردار کی اس خامی کے سبب وہ اپنے ماتحت عملہ کا رضا کارانہ تعاون حاصل نہیں کر سکے۔ نتیجہ یہ ہے کہ بیشتر دفاتر باہمی چپقلش اور سازشوں کا اکھاڑہ بنے ہوئے ہیں۔

ماہ دسمبر ۱۹۴۸ء ماہِ دسمبر ۱۹۴۸ء کے ابتدائی صفحات میں طلوعِ اسلام نے اربابِ حل و عقد کو مشورہ دیتے ہوئے لکھا کہ اگر آپ دل سے چاہتے ہیں کہ پاکستان مستحکم ہو جائے تو بنیادی طور پر چند تبدیلیاں فوراً کرنی پڑیں گی۔

۱۔ تمام صوبوں کو توڑ کر ساری مملکت کو مرکزی نظام کے ماتحت لے آیئے۔ اس سے وہ طبقہ جو محض پارٹیوں کے زور پر برسرِ اقتدار آگیا ہے اور اب شجرِ حکومت پر اکاس بیل کی طرح چھا رہا ہے۔ کہ بیل تو تر و تازہ ہو رہی ہے اور درخت دن بدن سوکھتا جا رہا ہے، الگ ہو جائے گا اور ساتھ ہی اخراجاتِ حکومت میں بڑی کفایت ہو جائے گی۔

(۱) مرکزی کابینہ کو وسیع کیجئے لیکن معیارِ انتخاب یہ رجحان قرار نہ پائے کہ کس کے تعین سے کون سی پارٹی خوش ہوتی ہے۔

۲۔ یہ سمجھ لیجئے کہ ہم زمانہ جنگ سے گذر رہے ہیں اس لئے کام کی رفتار اسی نہج سے مقرر کیجئے

(ii) مرکز کے موجودہ افسروں کو بتدریج اضلاع میں تبدیل کر کے ان کی جگہ نئے افسر متعین کیجئے۔ اطلاعات کے مطابق یہاں پارٹی بازی اس قدر شدید اور محکم صورت اختیار کر چکی ہے کہ اگر کچھ وقت اور یہی صورتِ حال رہی کی حکومت کی مشینری خود کارپردازانِ حکومت کے ہاتھوں سے تہس نہس ہو جائے گی۔

(iii) قوم پاکستان کے تحفظ کے لئے اپنا سب کچھ قربان کر دینے کے لئے تیار ہے لیکن قوم کا اعتماد حاصل کرنے اور ان سے رابطہ پیدا کرنے کی کوئی کوشش اس وقت تک نہیں کی گئی اس طرف فوری توجہ دیجئے۔

مجلسِ دستور ساز کے اراکین سے مجلسِ دستور ساز کے اراکین سے مخاطب ہو کر طلوعِ اسلام نے کہا:۔

مہذب اور وحشی ملک میں فرق یہ ہوتا ہے کہ مہذب ملک کا نظام ایک متعینہ آئین کے مطابق چلتا ہے اور وحشی ملک کا آئین متعین نہیں ہوتا۔

تشکیلِ پاکستان کے بعد سب سے بنیادی سوال۔ تدوینِ آئین کا تھا تاکہ یہ سرزمین بے آئین نہ رہنے پائے۔ یہ تھا وہ اہم فریضہ جو آپ حضرات کے سپرد کیا گیا۔

کیا آپ سے قوم پوچھ سکتی ہے کہ آپ نے اس فریضہ کی انجام دہی میں اس وقت تک کیا کیا؟ اور اگر کچھ نہیں کیا تو آپ کے پاس اس کی کوئی معقول وجہ بھی ہے۔

معاف فرمایئے! اگر آپ میں تدوینِ آئین کی اہلیت نہیں تو کھلے بندوں اس کا اعتراف کیجئے اور یہ فریضہ دوسروں کے سپرد کیجئے جو اس کی اہلیت رکھتے ہوں۔

اور اگر آپ میں اہلیت ہے لیکن محض اپنے تساہل یا تغافل کی وجہ سے آپ اس فریضہ کو سرانجام نہیں دے رہے تو یہ تغافل مجرمانہ ہے۔ اس کی جوابدہی کے لئے کسی عدالت کے کٹہرے میں آجایئے۔

اور اگر آپ اس سے مطمئن ہیں کہ آپ سے کوئی باز پرس نہیں کر سکتا تو اس جھوٹے اطمینان میں نہ رہیئے فطرت کے قانون کی گرفت سے کوئی نہیں بچ سکتا۔ اور اس کا قانون یہ ہے کہ
وَإِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ۙ ثُمَّ لَا يَكُونُوا أَمْثَالَكُمْ ۔ 47/38
اگر تم (اپنے فرائض کی سرانجام دہی سے) روگردانی کرو گے تو وہ تمہاری جگہ کسی دوسری قوم کو لے آئے گا جو تمہارے جیسی (نا اہل) نہیں ہوگی۔

اس ماہ کے لمعات میں ہندو قوم کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھا گیا ہے:۔

لمعات

ہندو قوم، ہر صاحب فکر کے لئے ایک معمّہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ پرانے واقعات کو چھوڑ کر صرف تقسیم ہند کے بعد کے معاملات کو لیجئے تو آپ حیرت میں رہ جائیں گے کہ اس قوم کے متعلق دنیائے اصول و اخلاق میں کیا رائے قائم کی جائے۔ ان کے بڑے بڑے لیڈروں کو دیکھئے تو ان کے قول و عمل میں کوئی موافقت نہیں ہوتی۔ وہ زبان سے کہتے کچھ ہیں اور کرتے کچھ ہیں۔ دنیا کے بڑے بڑے اجتماعات میں انکی تقریریں سنیئے تو وہ اپنے آپ کو ستّت (سچائی) کے دیوتا۔ اہمسا (عدم تشدّد) کے پجاری بتائے، (انصاف) کے شردھالو (عقیدت مند) اتیاچاری (ظلم) کے سب سے بڑے دشمن بتائیں گے اور دعویٰ کریں گے کہ ان کا مشن دنیا میں پریم اور شانتی (محبت اور امن) کا پرچار (تبلیغ) اور رام راج (خدا کی حکومت) کا قیام ہے ..... یہ کچھ ہے جو وہ زبان سے کہتے ہیں، بنارس کے مندروں میں۔ دہلی کی جامع مسجد میں۔ لندن کے ایوان شاہی میں۔ اقوام متحدہ کے اجلاس میں ہر جگہ ان کے نمائندے ان ہی اصولوں کو دہراتے اور ان ہی مقاصد کا اعلان کرتے نظر آئیں گے لیکن اس کے برعکس ان کے ڈیڑھ سالہ اعمال پر غور کیجئے تو صاف نظر آجائے گا کہ ان کا کوئی اصول ہے نہ دھرم۔ نہ دین ہے نہ ایمان۔ نہ انہیں کبھی اپنے وعدہ کا پاس ہوتا ہے نہ معاہدہ کا خیال۔ نہ سچائی سے کچھ علاقہ ہوتا ہے نہ انصاف سے کوئی واسطہ۔ وہ اپنی مقصد براری کے لئے ہر حیلہ کو جائز اور اپنی کامیابی کے لئے ہر طریق کو درست سمجھتے ہیں اور اپنے کئے پر نہ کبھی متاسف ہوتے ہیں نہ پشیمان۔ کھلے بندوں وعدہ خلافی اور فریب کاری کئے جاتے ہیں اور زبان سے مست اہمسا ایشور بھگتی کی مالا بھی جپتے جاتے ہیں۔ دنیا اس معمّہ کو حل کرنے سے قاصر تھی کہ اس قوم کے قول اور عمل میں ایسے کھلے ہوئے تضادات کی علّت کیا سمجھی جائے لیکن شکر گزار ہونا چاہیئے ہندوستان کے ہائی کمشنر متعینہ پاکستان (مسٹر سری پرکاسش) کا جنہوں نے اس معمّہ کو حل کرکے دنیا کو ایک بہت بڑی ذہنی پریشانی سے نجات دلا دی۔ انہوں نے ۱۳۔ نومبر کی شام تھیوسوفیکل سوسائٹی (کراچی) کے ہال میں ایک تقریر فرمائی جس کا عنوان تھا۔ ہندو مت، ایک ضابطۂ اخلاق کی حیثیت سے۔ اس تقریر میں انہوں نے بالکل واضح اور غیر مبہم الفاظ میں بتایا کہ جو شخص یہ سمجھتا ہے کہ ہندو مت کوئی مستقل اخلاقی ضابطۂ متعین کرتا ہے جس پر سوسائٹی کی بنیاد رکھی جا سکے، ایک بہت بڑی غلط فہمی میں مبتلا ہے۔ ہندو مت انسانی زندگی کے لئے کوئی غیر متبدّل اصول و اقدار پیش نہیں کرتا۔ بلکہ وہ ہر موقع

اور ہر مقام کے لحاظ سے مختلف اصول وضع کرتا ہے جو ایک دوسرے سے یکسر متضاد ہو سکتے ہیں۔ مثلاً وہ سوسائٹی کے ایک طبقہ (براہمنوں) کو اہنسا (عدم تشدد) کی تعلیم دیتا ہے تو دوسرے طبقہ (کھشتریوں) کو قتل وخوں ریزی سکھاتا ہے۔ یا مثلاً وہ پنڈتوں سے کہتا ہے کہ سچ بولو لیکن دلیش (تجارت پیشہ لوگوں) کو کبھی اس کا پابند نہیں ٹھہراتا کیونکہ وہ جانتا ہے کہ سچ بولنے سے تجارت میں نقصان ہوتا ہے اس لئے وہ واضح الفاظ میں انہیں جھوٹ بولنے کی اجازت دیتا ہے اور آگے بڑھیے وہ ایک برہمن کو صرف سنیاس (ترکِ دنیا) کی حالت میں اہنسا اور ست کی تلقین کرتا ہے لیکن وہی براہمن جب گرہست آشرم (اہل وعیال کی زندگی) بسر کر رہا ہو تو وہ اسے ان اصولوں کا پابند ٹھہراتا۔ مختصراً یہ کہ وہ اگر ایک قسم کے حالات میں سچ اور دیانت کی تاکید کرتا ہے تو دوسری قسم کے حالات میں جھوٹ اور فریب کو جائز قرار دیتا ہے۔ مسٹر سری پرکاشی نے اپنے ان دعویٰ کی دلیل میں اپنی مقدس کتابوں سے بطور سند اشلوک بھی پڑھ کر سنائے۔

اس کے بعد انہوں نے کہا کہ کسی کو یہ بات پسند آئے یا نہ آئے لیکن یہ ایک حقیقت ہے جس کا کھلے بندوں اعتراف کر لینا چاہیئے کہ ہندومت میں کوئی اصول زندگی قطعی (ABSOBITE) نہیں۔ ہر مصلحت کے لئے اس کا الگ اصول ہے۔ ہندومت ایک عملی مذہب ہے۔ وہ جانتا ہے کہ ہر موقع پر سچائی اور دیانت سے کام چل ہی نہیں سکتا۔ اس لئے وہ کبھی ایسی تعلیم نہیں دیتا جو ناممکن العمل ہو۔ یہی وہ راز ہے جس کی بنا پر ہندومت ہزارہا سال سے مختلف حالات اور متباین ماحول میں زندہ رہا ہے اور زندہ رہے گا۔

طلوع اسلام نے لکھا کہ

• مسٹر سری پرکاشی کے اس "دیانتدارانہ" اعترافِ حقیقت کو پیشِ نظر رکھئے اور پھر سوچئے کہ ہندو لیڈروں کے قول اور عمل میں ایسا کھلا تضاد کیوں ہوتا ہے۔ ہندوؤں کی ساری تاریخ میں صرف ایک سیاستدان کا نام آتا ہے، جو ارتھ شاستر کا مصنف ہے اس کا اصلی نام چانکیہ تھا لیکن اس نے اپنے تصنیفی نام "کوٹلیا" رکھ لیا تھا جس کے معنی مسٹر نارائن چندر بادبو پادھیا نے "فریب کار" کے لکھے ہیں۔ یورپ کے مورخ کوٹلیا کو ہندوستان کا میکیاولی کہتے ہیں جس کا مشہور فلسفۂ سیاست یہ ہے کہ مقصد کے حصول کے لئے جو ذرائع بھی ضروری سمجھے بے محابہ استعمال کر لینے چاہیئں۔ اگر آپ اپنی مقصد براری میں کامیاب ہو گئے تو یہ سب ذرائع جائز اور درست سمجھے جائیں گے۔ میکیاولی کا فلسفۂ سیاستِ مدن۔ اقوامِ یورپ کے لئے "صحیفۂ آسمانی" کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہی وہ تعلیم ہے جس کے حامل برملا کہتے ہیں کہ "میں اخلاقیات کا قائل ہوں۔ لیکن قوموں کے معاملے ان اصولوں کی رُو سے طے نہیں پایا کرتے (LORD GRCY) یا یہ کہ "ملکوں کی حفاظت شریف انسانوں کے بس کی بات نہیں اس لئے کہ شریف انسان اس حد تک

نہیں جا سکتے "جو مصلحت کا تقاضا ہوتا ہے" (WAL POLE) ہندوؤں کا مذہب وہ ہے جس کی وضاحت مسٹر سری پرکاشن نے فرمائی ہے اور بساطِ سیاست پر ان کے استاد وہ جن کے اقوال اوپر درج کئے گئے ہیں۔ یہ ہے وہ قوم جس سے، بدقسمتی سے، بدقسمتی سے پاکستان کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔

عالمِ اسلام

۱۴ نومبر ۱۹۸۴ء کو ریڈیو پاکستان کراچی سے "عالمِ اسلام" کے موضوع پر تقریر فرماتے ہوئے محترم پرویز صاحب نے کہا۔ انسان نے جب دیکھا کہ وہ ان مخالف قوتوں کا جو اس کے چاروں طرف پھیلی ہوئی تھیں، اکیلا مقابلہ نہیں کر سکتا تو اس نے اکٹھے مل کر رہنے کا انداز زندگی اختیار کیا۔ یہیں سے خاندان کی بنیاد پڑی۔ خاندان پھیل کر قبیلہ کی شکل اختیار کر گیا اور قبائل پھیلے تو اقوام بن گئے۔ اجتماعی زندگی کی ابتداء ہوئی تھی اس ضرورت کے ماتحت کہ اسطرح غیر انسانی قوتوں سے مدافعت کا سامان بہم پہنچایا جائے مثلاً جنگل کے درندوں یا ارضی وسماوی آفات وحادثات وغیرہ۔ لیکن جب باہمی مفاد کا تصادم ہوا تو خود ایک خاندان دوسرے خاندان کا، ایک قبیلہ دوسرے قبیلہ کا، اور ایک قوم دوسری قوم کی دشمن بن گئی۔ بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۵ پھر اشتراک مفاد کے تحت ایسا بھی ہوا کہ کچھ خاندان اکیطرف اور کچھ دوسری طرف ہو گئے۔ بعض قبائل نے باہمی اتحاد سے دوسرے قبائل کے مقابل متحدہ محاذ قائم کر لیا۔ کچھ اقوام باہمی معاہدات سے ایک گروپ میں شامل ہو گئیں اور دوسری اقوام، فریقِ ثانی بن گئیں۔ انسانی زندگی کی ساری تاریخ پر غور کیجئے وہ اسی قسم کی گروہ بندیوں اور فرقہ سازیوں کی مسلسل داستان نظر آئے گی۔ حتیٰ کہ آج بھی جب کہ انسان بزعم خویش، فلسفۂ اجتماع اور سیاست مدن کی انتہائی بلندیوں تک پہنچ چکا ہے۔ اقوامِ عالم ان ہی گروہ سازوں کی ادھیڑ بن میں مصروف تعمیر وتخریب ہیں۔ قومیت کی بنیاد آج بھی اسی طرح خون۔ رنگ۔ نسل۔ زبان۔ وطن کے اشتراک پر ہے جس طرح انسانی زندگی کے ابتدائی دَور میں تھی۔ صدیوں کے تجربہ اور قرنہا قرن کے علمی سرمایہ کے باوجود، یہ ان حدود سے بلند نہیں ہو سکا اور اس کا خمیازہ بھگت رہا ہے۔

آج سے چودہ سو سال پیشتر ایک تحریک اٹھی جس نے انسانی اجتماعیت یا قومیت کی بنیاد۔ نسل زبان یا وطن کے اشتراک کے بجائے وحدتِ خیال وفکر پر رکھی جسے مذہب کی زبان میں عقائد اور دورِ حاضرہ کی اصطلاح میں (IDEOLEGY) کہا جاتا ہے۔ قومیت کا یہ تصور انسانی تاریخ میں ایک بہت بڑے انقلاب کا موجب تھا۔ اس جدید تصور کے ماتحت، سرزمین حجاز میں ایک نئے انداز کی قوم وجود میں آئی۔ جو دنیا میں ملّتِ اسلامیہ کے نام سے متعارف ہوئی۔ اس قوم کے اجزائے ترکیبی ان متضاد اور متخاصم عناصر پر مشتمل تھے جو دنیا کے تصورِ قومیت کے ماتحت کبھی ایک قوم نہیں بن سکے تھے۔ حبشہ کے بلالؓ، روم کے صہیبؓ، فارس کے سلمانؓ عرب کے ابوبکرؓ۔ خون، نسل، رنگ، زبان اور وطن کی وحدتوں کو توڑ کر اس نئی قوم کے افراد بنے جن میں وجۂ جامعیت

صرف وحدتِ ایمان تھی۔ اس کے برعکس خود مکّہ کے قریش جو اس وحدتِ عقائد میں شریک نہ ہوئے تھے، قریب ترین رشتہ دار ہونے کے باوجود، دوسری قوم کے افراد تھے جو فریقِ مقابل کی حیثیت رکھتے تھے۔ بدر کے میدان نے، کہ جسے قرآن نے اسی جہت سے یوم الفرقان کہا ہے، قومیت کے اس نئے فرق کو نمایاں طور پر اپنے سامنے دیکھ لیا۔ جب کیفیت یہ تھی کہ باپ ایک طرف تھا اور بیٹا دوسری طرف، ایک بھائی ایک طرف تھا اور دوسرا بھائی دوسری طرف، ماموں ادھر تھا اور بھانجا ادھر۔ چچا اُدھر اور بھتیجا ادھر۔ داماد ایک طرف تھا اور خسر دوسری طرف۔ قومیت کا یہی وہ جدید تصور تھا جسے دنیا آج تک نہیں سمجھ سکی اور اس کی وجہ سے وہ اسلام اور مسلمانوں کے متعلق طرح طرح کی غلط فہمیوں میں گرفتار چلی آ رہی ہے۔

موصوف نے فرمایا کہ اس تصور میں بنیادی عقیدہ توحید کا ہے۔ یعنی اس پر ایمان کہ کائنات کا خالق، زندگی کا سرچشمہ اور تمام نظامِ عالم کا حاکم مقتدر خدائے واحد القہار ہے۔ وحدتِ خالق کے اسی بلند و بالا عقیدہ سے وحدتِ خلق کا عقیدہ پیدا ہوتا ہے۔ یعنی یہ عقیدہ کہ جب زندگی کا سرچشمہ ایک ہے تو زندگی کے مظاہر بھی اپنی اصل و بنیاد کے اعتبار سے برابر ہیں یہی عقیدہ مساواتِ انسانی اور احترامِ آدمیت کی بنیاد ہے جس پر دنیا کی امن و سلامتی کا مدار ہے۔

لیکن صرف خدا کی ہستی کا اقرار نہ انسانی ہدایت کے لئے کافی ہو سکتا ہے نہ اس سے قومیت کی تشکیل ہو سکتی ہے۔ دنیا میں سوائے چند دہریوں کے، سب خدا کی ہستی کا کسی نہ کسی شکل میں، اقرار کرتے ہیں۔ قومیت کی تشکیل کے لئے رسالت پر ایمان ضروری ہے۔ ملّتِ اسلامیہ محمدؐ رسول اللہ پر ایمان رکھنے کی بناء پر ایک جداگانہ امّت قرار پائی ہے۔ صرف خدا پر ایمان رکھنے کی بناء پر نہیں۔ ختمِ نبوّت کے معنی یہی ہیں کہ ملّتِ شریفہ قیامت تک ایک مستقل اور جداگانہ قوم کی حیثیت سے زندہ رہے گی۔ جسطرح ایک عیسائی محمدؐ رسول اللہ پر ایمان لے آنے سے، ملّتِ نصرانیہ سے کٹ کر، ملّتِ اسلامیہ کا فرد بن جاتا ہے۔ اسی طرح اگر آج ایک مسلمان رسول اللہؐ کے بعد کسی اور رسول پر ایمان لے آئے تو وہ ملّتِ اسلامیہ سے الگ اس دوسری ملّت کا فرد قرار پاجائے گا، جو اس رسولؑ کی نسبت سے وجود میں آئے گی۔ اس لئے اس تصورِ قومیت کی بناء پر جسے اسلام نے پیش کیا ہے توحید کے بعد رسالت حضور ختم المرسلینؐ پر ایمان لانا ضروری ہے۔

(جاری ہے)

(اس کا باقی حصّہ اگلے شمارہ ستمبر ۱۹۸۵ء میں پڑھیے)

(مرتبہ:۔ محمد اسلام نمائندہ بزمِ طلوعِ اسلام کراچی)